# آوارہ گرد کی رائے

اسلم خواجہ

# آوارہ گرد کی رائے

(کالموں کا انتخاب)

اسلم خواجہ

شہرزاد
SCHEHERZADE

**Awara Gard Ki Rai**

*(Selected Columns)*

*By. Aslam Khwaja*


پہلی اشاعت: ۲۰۰۵ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی info@ahmedgraf.com

طابع: دی سمیع سنز پرنٹرز، کراچی

شہرزاد

SCHEHERZADE

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

info@scheherzade.com

## انتساب

آوارہ گردی کے نام

# فہرست

آداب آشنا نہ سہی......، تعارف، حارث خلیق ........ ۷
لاہور، قصور اور بھٹائی کی نگری ........ ۹
ہرتان ہے دیپک ........ ۱۳
قصہ پشاوری ٹرین میں سفر کا ........ ۱۶
حیدر آباد کے خالی رستے اور ''کھچچو کنونشن'' ........ ۲۰
''بانو تیرے بندے'' جدوجہدِ لاحاصل ........ ۲۳
مسکراہٹوں کے لاہوری سوداگر ........ ۲۶
نیٹی جیٹی کا ''جادو'' ........ ۳۰
چائے، روایتیں اور کولڈ کافی ........ ۳۳
گولی کا نشانہ بننے والے بچے کا نوحہ ........ ۳۷
شادی، ہاتھ ریکھا اور آرٹسٹوں کے اچھوتے خیال ........ ۴۰
میزان۔ ناسٹلجیا اور آنسوؤں کے موتی ........ ۴۴
ستار ایدھی— گاؤں سے پہلی مرتبہ شہر آنے والا بچہ ........ ۴۷
بے گھر شہزادے اور گھر کا گم شدہ پتہ ........ ۵۰
پروین شاکر۔ ''بڑا ہے درد کا رشتہ'' ........ ۵۳
ماضی— مستقبل اور ایدھی کا جھولا ........ ۵۶

گم نام کارکن اور تاریخ کی سرد ایش ٹرے ........ ۶۰
سفر کی ریکھا ........ ۶۳
چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا ........ ۶۶
سیمنٹ کے چبوترے پر کتّے کا پنجہ ........ ۷۰
ایک گلوکار کا قتل ........ ۷۴
درد کی میٹھی چبھن ........ ۷۷
پونا انسٹیٹیوٹ اور برسوں پرانی خواہش ........ ۸۰
گا نہیں سکتے تو کیا ہوا ........ ۸۵
فلمی پوسٹر، تانگے اور دوڑتے بچّے ........ ۸۹
بے عقل دنیا کے عقل مند بچّے ........ ۹۴
New Faces of Sindh ........ ۹۸
نجم السحر ........ ۱۰۱
بین الاقوامیت — جدو جہد سے کوکا کولا کلچر تک ........ ۱۰۴
عزرائیل کو شکست دینے کی تمنّا ........ ۱۰۷
گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں کراچی کے نوحے ........ ۱۱۲
بخت آور، بے نظیر اور کاریوں کے قبرستان کی آہ و بکا ........ ۱۱۷
دھرتی کے دو مرجھائے ہوئے پھول ........ ۱۲۱
پی ایم اے ہاؤس کی عجب دنیا ........ ۱۲۵
روشن نینوں کے مرجھائے ہوئے سپنے ........ ۱۲۹
فلسطین، ریگل چوک اور یہودی کی لڑکی ........ ۱۳۲
دہشت گردی۔ انسان کے چہرے پر لعنت ........ ۱۳۷
ایدھی اور اُس کے رضا کار زندہ باد ........ ۱۴۱
اروناکی اروما ........ ۱۴۵
دیس چھوڑ کر پردیس بھٹکنے والوں کا نوحہ ........ ۱۴۸
موت......؟ ........ ۱۵۲

# آداب آشنا نہ سہی......

وہ ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوا اور میں۱۹۶۶ء میں کراچی میں۔ ہم دونوں ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، مگر اسلم خواجہ سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ مجھے یادنہیں۔ یہ عرصہ اتنا طویل ضرور ہے کہ ہمارے مشترکہ جاننے والے میرے حوصلے کی داد دیے بغیرنہیں رہتے۔ اسلم کے عزیزوں، دوستوں اور واقف کاروں میں مجھ سمیت شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جسے بھرے بازار میں، کسی محفل میں، کراچی کے پی ایم اے ہاؤس میں، حیدرآباد کی کھدڑا گلی میں یا لاہور کی المشہور گوالمنڈی فوڈ اسٹریٹ میں، اسلم کے ہاتھوں ٹوپی اچھالے جانے یا گالیاں کھانے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ دیدہ اور شنیدہ دونوں واقعات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ 'رولاک جی رائے' کے اصل سندھی ایڈیشن سے زیادہ ضخیم کتاب تیار ہوجائے۔ اس سلسلے میں اسلم ذات، پات، رنگ، نسل، عقیدہ، زبان، جنس، عمر جیسی خصوصیات کی بنیاد پر تفریق میں یقین نہیں رکھتا۔ البتہ اس بات کا امکان ضرور موجود رہتا ہے کہ اسلم مخاطب کی عزّت افزائی کرتے ہوئے اُس کی نسل، زبان، خاندان وغیرہ سے متعلق کچھ تاریخی حوالے دیتا جائے۔ اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ چوں کہ اپنے کالموں پر کسی لائق یا ذمّہ دار شخص سے کچھ لکھوانے کے لیے نہ تو اسلم خود تیار ہے اور نہ شاید وہ تیار ہیں۔ سو قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند۔

اِن کالموں میں جو سادگی، راست گوئی، غصّہ اور لااُبالی پن جھلکتا ہے وہ اسلم ہی کا حصّہ

ہے۔ وہ واقعی رولاک ہے۔ یہ محض اس کا قلمی نام نہیں جو بہت مرتبہ لکھنے والے کی، کچھ اور ہونے یا کسی اور حیثیت سے پہچانے جانے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ آوارگی اسلم کا طرزِ زندگی ہے۔ اُس نے بے گھری کو سکونت پذیری پر ترجیح دی ہے۔ اُس کا وجود اور اس کے کالم بہتے ہوئے شفاف پانی کی طرح سیاسی اور معاشی نظام کے ٹھہرے ہوئے گدلے پانی میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اسلم نے زندگی اور موت دونوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ درد سہے ہیں اور دُکھ بانٹے ہیں۔ رویا ہے، جھنجھلایا ہے، بیمار ہوا ہے، جھگڑا ہے، ہنسا ہے، قہقہے لگائے ہیں۔ اس میں بہت کچھ یہاں اس کے کالموں میں رَچا ہوا ہے مگر کچھ باتیں ابھی باقی ہیں اور میری خواہش ہے، جس کا اظہار میں اسلم سے کئی بار کر چکا ہوں، کہ وہ پھر پابندی سے یہ کالم لکھنا شروع کر دے۔ لیکن رولاک کو کسی بھی چیز کے لیے پابند کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی رولاک خود دوسروں کو پابند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسا کہ اُس نے مجھے یہ لکھنے کے لیے پابند کیا۔ مگر انہی سب لڑائیوں اور سماجی رویّوں میں فرق کے باوجود ہم میں ایسا کون سا رشتہ ہے کہ اُس نے مجھے پابند کیا اور میں پابند ہو گیا۔ یہ رشتہ درد کا رشتہ ہے اور بہت بڑا ہے۔ بہت گہرا ہے۔ اب آگے کیا کہوں؟

حارث خلیق

اسلام آباد، ۱۳ جنوری ۲۰۰۲ء

# لاہور، قصور اور بھٹائی کی نگری

آوارہ گرد کے تمام دوست احباب جانتے ہیں کہ وہ تکلفات سے آزاد، گھومنے پھرنے اور میلے تماشے دیکھنے کا شوقین ہے۔ اس لیے ہی آوارہ گرد کے ایک انارکسٹ دوست نے اسے ''فنکشن برڈ'' کا نام دیا تھا۔

ان ہی آوارہ گردیوں کے دوران آوارہ گرد کو پنجاب میں رہتے ہوئے کئی ایک ایسی چیزوں سے واسطہ پڑا جو اگر سندھ میں ہوں تو شاید اُس کی پچاس فی صدی آوارہ گردی ختم ہو جائے۔ حیدرآباد میں اپنے بچپن اور جوانی کے دن گزارنے والے آوارہ گرد نے جب انارکلی لاہور میں رات گئے تک نوجوانوں کی مختلف ٹولیاں ہوٹلوں اور فٹ پاتھوں پر بیٹھے دیکھیں تو فیصلہ کرلیا کہ حتی المقدور کوشش کرتے ہوئے زندگی انارکلی کے آس پاس ہی گزاری جائے گی۔

دوسری بات جو آوارہ گرد کو لاہور میں بھا گئی وہ تھی بسنت۔ فروری میں ہونے والی بسنت کی تیاری اکتوبر/نومبر سے شروع ہوگئی۔ آوارہ گرد کے تمام لاہوری دوست اسے بسنت کے حوالے سے کپڑے سلوانے اور دوسری تیاریوں کے مشورے دیتے رہے لیکن آوارہ گرد، جو ایسے شہروں سے وہاں گیا تھا جہاں کرفیو اور فساد کے تہوار ہی طے شدہ ہوتے ہیں، حیران وپریشان ہی ہوتا رہا۔ بہ ہرحال بسنت کے خیر مقدم کے لیے آوارہ گرد نے بھی کھدّر کا بسنتی جوڑا سلوایا۔

بسنت سے ایک رات قبل لاہور کی ہر گلی اور کوچے میں لوگ اس طرح گھوم پھر رہے تھے کہ آوارہ گرد کو دس اپریل ۱۹۸۶ء کو لاہور میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا تاریخی استقبال یاد آ گیا۔ گھروں کی چھتوں پر سرچ لائیٹوں اور ان کی روشنی میں ڈوبی گُڈیاں (پتنگ) اور پیلے جوڑوں میں گُڑیاں (لڑکیاں)، جیسے زندگی کی تمام تر سُندرتا اُس رات لاہور میں امڈ آئی تھی۔

آوارہ گرد کا خیال تھا کہ رات کے تھکے ہارے لوگ دوسرے دن بستر سے ہی نہیں نکل پائیں گے لیکن حیرت اس وقت ہوئی جب رات چار بجے سونے والے آوارہ گرد کے ایک دوست نے اسے صبح چھ بجے ایک موٹی سی گالی دے کر اور یہ کہہ کر نیند سے جگا دیا کہ ”بسنت کا دن بھی سونے کے لیے ہوتا ہے۔“

کمرے سے باہر کی تو دنیا ہی کچھ اور تھی۔ رات جیسی ہی کارستانی! آسمان میں، کسی پرندے کے پر مارنے جتنی گنجائش بھی نہیں تھی۔ ہر پل پتنگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی میں پتنگ کی دکان پر اس طرح دھکم پیل ہو رہی تھی جس طرح اپنی کراچی کے بندر روڈ پر صابری نہاری ہوٹل پر ہیروئنچی مفت کے کھانے کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن یہاں تو پتنگ اور مانجھا پیسوں میں مل رہے تھے۔

پہلے تو آوارہ گرد سمجھا کہ کچھ ”غیر سنجیدہ“ اور غیر آدرشی لوگ ہیں جو پتنگیں اڑا کر تماشا کر رہے ہیں تاہم جب وہ بسنت کے اپنے میزبان کی اندرون شہر پانچویں منزل کی چھت پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ معاملہ ”ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، سب ہی اس زلف کے اسیر ہوئے“ کا سا تھا۔ وہ نوجوان اور بوڑھے جو محض دو دن پہلے تک غیر طبقاتی سماج کی ضرورت پر کنوینس کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے، وہ بھی آج فقط بوکاٹا میں مصروف تھے۔

آوارہ گرد کو نہ لٹّو چلانا آتا ہے نہ پتنگ اڑانا، لیکن اس دن دوستوں کے اصرار پر وہ بھی پتنگ اڑانے اور اپنی انگلی کٹوانے سے باز نہیں آیا۔ ہر پتنگ کے کٹنے پر اچھی خاصی ہوٹنگ ہو رہی تھی۔ ایسی خوش گوار اور بامعنی ہوٹنگ آوارہ گرد نے اپنی زندگی میں اس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔

پتنگ کٹوانے، لمبے کش کا گہرا دھواں چھوڑنے اور تفریح بازی کا یہ سلسلہ سانجھ سے تک چلتا رہا۔ آکاش پر جیسے ہی کسی حال ہی میں خضاب لگانے والے بوڑھے جیسی سیاہی ظاہر ہوئی تو چاروں اطراف سے بندوقیں گرجنے لگیں۔ آوارہ گرد پہلے تو سمجھا کہ ”پیارے“ اور ”بھیا“

یہاں بھی پہنچ گئے! لیکن حیرت تو اس وقت ہوئی جب گولیاں اوپر فضا میں عجیب و غریب مینا کاری کرتی دکھائی دیں۔ گول دائرے، چوکور اور تکون تو جیسے عام سی بات تھی۔

آوارہ گرد کی اس دن بس یہی خواہش تھی کہ ایسا کوئی تہوار سندھ میں بھی ہو۔ کاش ہمارے دانش ور ''بھٹائی کے فنّی پہلو'' تلاش کرنے سے کچھ وقت نکال کر اس جمالیاتی تہوار کے متعلق بھی سوچیں!

آوارہ گرد نے ایک دوسرا دلچسپ مقام لاہور کے قرب وجوار میں حضوری باغ دیکھا۔ ہر جمعہ کے دن اس باغ میں قصّہ گو مختلف ٹولیوں کی صورت میں آتے ہیں اور کراچی کے صدر اور حیدر آباد کے رانی باغ کے مداریوں کی طرح ٹولے بنا کر نثر اور شاعری میں قصّہ سناتے رہتے ہیں۔ ان یاروں کا سلسلہ بھی سانجھ سے تک چلتا ہے، سانجھ کو جب پنچھی حضوری باغ کے درختوں پر بسیرا کرتے ہیں تو یہ جانی جگر اپنا سامان سمیٹنا شروع کرتے ہیں لیکن پورا دن بغیر معاوضہ لیے لوگوں کو الگ الگ قصے سنانے والے جاتے سے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان قصّہ خوانوں میں سب سے طویل العمر شخص مالک کے حضور دعا مانگتا ہے۔ لیکن یہ دعا ضیائی مجلس شوریٰ کے سرکاری ملّاؤں کی دعا سے یکسر مختلف ہوتی ہے جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، انسان، چرند پرند سب کے لیے دعا مانگی جاتی ہے۔ آوارہ گرد نے زندگی میں پہلی مرتبہ خود کو دعاؤں میں شریک بھی حضوری باغ میں ہی محسوس کیا تھا!

لاہور ہی میں مادھولال حسین ہیں۔ سرمد کی طرح ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہونے والے شاہ حسین کا میلہ آوارہ گرد کے خیال میں پاکستان کا واحد غیر سرکاری میلہ ہے۔ اس میلے کا انتظام بھی آوارہ گرد کے پنجابی بولنے والے ''جوڑ یوال'' کرتے ہیں۔ آوارہ گرد سندھ میں ایسے کسی اہم غیر سرکاری میلے کے متعلق نہیں جانتا۔

لاہور سے آدھے پونے گھنٹے کے فاصلے پر بابا بلّھے شاہ کی نگری قصور ہے۔ قصور کے مدّمقابل شاید ہی کوئی شہر برصغیر میں ہو۔ بلھے شاہ، نظام لوہار، استاد بڑے غلام علی خاں اور میڈم نور جہاں کا شہر قصور، شہید بھٹو کے عدالتی قتل کے ذمّہ دار نواب محمد احمد خان کا شہر بھی یہ ہی ہے۔

بابا بلھے شاہ کا مزار، بھٹائی کے مزار کی طرح بارعب تو نہیں البتہ بھٹائی کے مزار کی طرح وہاں کسی ایک خاندان کی اُجارہ داری بھی نہیں۔ بلھے شاہ کے مزار کے صحن پر ہر کوئی اپنے گانے بجانے کی منڈلی سجا سکتا ہے۔ آوارہ گرد کی موجودگی میں ہی آٹھ دس نیم دیہاتی گانے والے

فقیر وہاں آئے اور اپنا ہارمونیم اور اکتارہ نکال کر گانے لگے۔ انہیں جو روپے پیسے ملے اس میں سے مزار کے کسی متولی یا فقیر نے کوئی حصہ نہیں بٹورا۔ بھٹائی کی نگری میں ایسا نہ جانے کیوں نہیں! ورنہ بھٹائی کو سیّد زادوں کے علاوہ ایک اور آوارہ گرد شاہد بھٹو نے بھی خوب گایا ہے۔ آوارہ گرد کی ہزاروں خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی ہے کہ شاہد بھٹو جیسے سریلے راگی سے لے کر آوارہ گرد کے بے سُرے دوستوں تک ہر کوئی بھٹائی کے صحن میں دل کھول کر گائے۔ ہے کوئی جو آوارہ گرد کی ان چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل کے لیے دعا کرے۔ جو دے اُس کا بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا!

# ہر تان ہے دیپک

کچھ دن ہوئے کہ آوارہ گرد رات کو لاہور سے راولپنڈی جا رہا تھا۔ رات کے ساڑھے تین بجے ایئر کنڈیشنڈ کوچ بارش کی بوندوں میں بھیگی جی ٹی روڈ لتاڑ رہی تھی کہ کوچ کے ٹیپ ریکارڈر سے لتا کی آواز گونجنے لگی۔ نہ جانے کس پل لتا نے اپنی پُرسوز آواز میں ''توڑ دیا دل میرا تونے ارے او بے وفا'' گانا شروع کیا کہ آوارہ گرد کے ایک ہم سفر نے تقریباً ویسی ہی پُرسوز آواز کے ساتھ پنجابی میں کہا ''مار دتا ای لتا!''

آوارہ گرد نے یہاں وہاں نظر دوڑائی تو پچاس بچپن برس کا ایک شخص بے چین دکھائی دیا۔ اپنی سیٹ سے اٹھ کر جب اس سے من کی دنیا میں پیش آنے والی وارداتوں سے متعلق بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے فقط یہی کہا ''چھڈو جی! مٹی پاؤ۔''

سنگیت بھی عجیب چیز ہے۔ بندے کی ایسی درگت بناتی ہے کہ مرگلا کی پہاڑیوں سے گر کر بھی شاید ہی اتنی تکلیف ہوتی ہو۔ اسی سنگیت کے جادو پر رائے ڈیاچ نے گردن کٹوائی۔ آوارہ گرد کا خیال ہے کہ اس گردن کٹوانے میں رائے ڈیاچ کے وعدے کا پکا ہونے سے زیادہ کمال بیجل کے فن کا ہے۔ سنگیت، جس سے اب تو روحانی وجسمانی عذابوں کا علاج بھی ہونے لگا ہے، سنگیت کی یہ ہی خوبی آوارہ گرد کی رائے میں سننے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

آوارہ گرد کو فروری ۱۹۸۹ء کی وہ رات یاد آ رہی ہے جب لاہور میں منعقدہ فیض میلے

کے دوران عابدہ پروین نے ''گھوم چرخڑہ سائیاں دا'' گانا شروع کیا تو میلے میں موجود لوگ تو کیا، ارد گرد کی بے جان چیزیں بھی چرخے کی طرح گھومنے لگی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ''چرخے'' پر کسی کا ہاتھ ہو اور کوئی بھی اپنے بس میں نہ ہو۔

اسی عابدہ پروین نے جب حال ہی میں ایک ٹی وی پروگرام میں ''اللہ ہو'' گانا شروع کیا تو آوارہ گرد نے ایک ایسے شخص کو جو برلن دیوار اور سوشلسٹ بلاک کے خاتمے کے بعد بھی اپنے تمام سالم حواسوں کے ساتھ کمیونسٹ/ سوشلسٹ ہے، عابدہ کے ساتھ اللہ ہو کہتے سنا اور دیکھا۔ اس بارے میں کوئی اور رائے ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ کمیونسٹ ''مشرف بہ اسلام'' نہیں ہو رہا تھا بلکہ یہ نعرہ وہ عابدہ کی گائیکی کے ٹرانس میں آ کر لگا رہا تھا۔ آوارہ گرد نے اعلا طبقات کے افراد کی کچھ محفلوں میں اقبال بانو کو فیض احمد فیض کا کلام گاتے ہوئے سنا ہے۔ وہ جب ''ہم دیکھیں گے'' گاتی ہیں تو کسی فیکٹری کے مزدور سے لے کر اسی فیکٹری کے مالک، بیوروکریٹ اور یہاں تک کہ فوجی جرنیلوں کو بھی آوارہ گرد نے مست ہو کر جھومتے دیکھا ہے۔ وہ جب فیض کے مصرعے ''یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی'' گاتی ہیں تو آوارہ گرد نے حقیقتاً دھرتی دھڑکتے محسوس کی ہے۔

سنگیت کیا ہے اور یہ پریتما کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب آوارہ گرد کے پاس تو کیا کسی بڑے گائک کا پاس بھی شاید ہی ہوگا! استاد امانت علی خاں سے ایک انٹرویو کے دوران جب یہ پوچھا گیا کہ وہ گاتے کیوں ہیں، تو استاد نے پہلے تو کہا کہ یہ بھی کوئی سوال ہے۔ لیکن جب جواب دینے کا وقت آیا تو پندرہ بیس منٹ تک اٹکتے رہے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ بس اتنا ہی کہا، ''بس یار! گاتا ہوں۔ یہ کافی نہیں؟''

سُر سنگیت کی دنیا سے تعلق رکھنے والے آوارہ گرد کے ایک لاہوری دوست نے اسے بتایا کہ پاکستان کی بہترین رومانی فلم ''دوستی'' کے ایک گانے ''یہ وادیاں، یہ پربتوں کی شاہزادیاں'' ریکارڈ کرانے کے لیے فلم کے موسیقار میڈم نور جہاں سے کوئی چودہ گھنٹے ری ٹیک کراتے رہے۔ اس وقت تو آوارہ گرد کو یہ بات خیالی لگی لیکن جب کچھ دنوں کے بعد یہ گیت دوبارہ سنا تو بات میں وزن محسوس ہوا۔ اس گانے کے دوران جب نور جہاں یہ وادیاں کہتی ہیں تو اس کے صوتی اثرات سے سچ مچ وادیوں کا تصور ابھر آتا ہے۔

بات سے بات یاد آئی کہ جب فلم ساز کے آصف مشہور زمانہ فلم ''مغل اعظم'' بنا رہے

تھے تو اس میں استاد بڑے غلام علی خاں کا ڈیڑھ منٹ کا کوئی راگ بھی شامل کرنا تھا، جب کمپنی کا ایک سرکردہ شخص منزلیں پھلانگتا بمبئی سے قصور پہنچا تو استاد نے بمبئی جانے سے انکار کرتے ہوئے اس کی ریکارڈنگ قصور میں کرنے پر زور دیا۔ اس پر اس فلم کا ہیرو اور برصغیر کا مشہور ترین اداکار دلیپ کمار استاد بڑے غلام علی کے پاس آیا اور کہنے لگا، ''میں دلیپ کمار ہوں، مغل اعظم کا ہیرو،'' راوی کے مطابق استاد بڑے غلام علی خاں نے جواب دیا ''میں غلام علی خاں ہوں، جس کے بغیر شاید یہ فلم مکمل نہیں ہوگی۔''

بالآخر مغل اعظم کا پورا یونٹ اپنا سامان سمیٹ کر قصور پہنچا اور ڈیڑھ منٹ کی ریکارڈنگ کے لیے مہینہ بھر قصور میں ٹھہرا۔

یہ ہی استاد بڑے غلام علی خاں جب کسی بات پر ناراض ہوکر پاکستان سے بھارت چلے گئے تو اس زمانے کے بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے استاد کے پیر چھو کر ان کا استقبال کیا۔ بس صاحب! ایک سربراہ کسی گائک کے پیر چھوتا ہے دوسرا خانم گوگوش کو گولیوں سے چھلنی کرنے کی بات کرتا ہے! اگر آوارہ گرد کا بس چلے تو اس دنیا کا نظام ام کلثوم، خانم گوگوش، عابدہ پروین، لتا، جگجیت اور اس قبیل کے دیگر لوگوں کو سونپ دے، پھر دیکھیں کہ کون بوسنیا کی مسلمان لڑکی اور عیسائی گھبرو کے پیار میں گولیوں کا بیج بوتا ہے!

# قصّہ پشاوری ٹرین میں سفر کا

آوارہ گرد کی دیرینہ خواہش تھی کہ پاکستان کے اہم ابتدائی شمالی ریلوے اسٹیشن (پشاور) سے کوئی سفر کرے۔ ماضی میں تین چار مرتبہ پشاور یاترا کے باوجود یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ سُو، کچھ عرصہ قبل پشاور جانے پر تین چار گھنٹے گرمی میں ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کرنے کی اذیت برداشت کرکے بھی اس نے ریل گاڑی کے ذریعے پشاور سے راولپنڈی سفر کیا۔

آوارہ گرد کے پاس ایک "نیم ٹورسٹ" بیگ ہے۔ سو جب یہ بیگ گاڑی میں رکھا تو اس کا عجیب وغریب حلیہ دیکھ کر ایک سی آئی ڈی والا چڑھ دوڑا کہ بیگ کی تلاشی ہوگی۔ آوارہ گرد نے سوچا کہ یہ معمولی سی کارروائی ہے۔ سو بیگ کھول کر دکھایا جس میں کپڑوں کے دو جوڑے، ایک جوتا اور کچھ کتابیں تھیں۔ بہ ہر حال وہ چلا گیا۔

پھر پشاور کے ہی کسی دوسری اسٹیشن پر سابقہ "فرشتے" کے ہی کسی ہم پیشہ نے اسی نوعیت کی "فرمائش" کی۔ اس وقت آوارہ گرد نے محسوس کیا کہ سارا قصور اس نیم ٹورسٹ بیگ اور آوارہ گرد کی جینز ہے کیوں کہ اس بوگی میں آوارہ گرد سمیت پینٹ پہنے ہوئے تمام مسافروں کی تلاشی ہوئی جب کہ شلوار قمیص والوں کو نظر انداز کیا گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی ورنہ سندھ اور پنجاب میں تو جو لوگ حلیے سے (شلوار کے بجائے پینٹ پہنے ہوئے اور ہاتھ میں انگریزی اخبار یا کوئی کتاب لیے ہوئے) پڑھے لکھے لگتے ہیں ان سے کوئی پولیس والا خوامخوہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔

پشاور کے پولیس والوں کی یہ حرکت آوارہ گرد کو ذاتی طور پر پسند تو نہیں آئی تاہم اسے یہ احساس ضرور ہوا کہ دیسی انگریزوں کو بھی آنکھ دکھانے والا کوئی ہے ضرور!

بہ ہر حال پشاور کینٹ سے راولپنڈی چلنے والی اس ریل گاڑی کی چال کسی زمانے میں حیدرآباد سے بدین کے درمیان چلنے والی ''لنڈو ایکسپریس'' کی طرح مست تھی۔ آوارہ گرد نے اپنی زندگی کے ریل کے ابتدائی سفر اسی ایکسپریس میں کیے ہیں اور شاید آوارہ گرد کی آوارہ گردی میں بڑا حصّہ اسی ریل گاڑی کا ہے۔ بات چل رہی تھی پشاور سے پنڈی ریل کے ذریعے سفر کی اور ہم جا پہنچے ''جھٹ پٹ بدینائی'' کے دیس کی لنڈو ایکسپریس تک۔ بہ ہر حال دو مرتبہ تلاشی کے سوا اس لاجواب سفر کی کیا بات ہے! سندھ کی طرح شمال مغربی سرحدی صوبہ (پختونخواہ) کے ریلوے اسٹیشنوں کے نام انگریزی اور اردو کے ساتھ پشتو میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ پشتو میں لکھے ہوئے ناموں سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ آپ اس وقت کس صوبے میں سفر کر رہے ہیں۔

میدانی علاقوں سے تعلق رکھنے والا آوارہ گرد ریل کی کھڑکی سے بلند قامت پہاڑ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اندھیرا چھا گیا۔ ایسی تاریکی کا تجربہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بلیک آؤٹ کے بعد پہلی مرتبہ ہونے پر آوارہ گرد پہلے تو گھبرا گیا لیکن ایک دم اندھیرا چھٹنے پر احساس ہوا کہ اٹک اور نوشہرہ کے پہاڑی درّوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ درۂ بولان کے برعکس یہاں آٹھ دس درّے ہیں جن کے درمیان سے گزرتے ہوئے ریل گاڑی کی آواز ہی بدل جاتی ہے۔

رگ وید میں ہے کہ ''اوماں! ہمیں تاریکی سے بچا، کہ وہ ڈائن ہے، موت کی سہیلی ہے۔'' تاہم آوارہ گرد نے تاریکی کے متعلق ایک دلچسپ بات رگ وید یا گیتا میں پڑھی ہے کہ کرشن نے جب اپنی ماں سے مکھن مانگا تو اس کی ماں نے دیگر ماؤں کی طرح بیٹے کی فرمائش سے جان چھڑانے کے لیے رات کو مکھن دینے کا دلاسا دیا۔ اس پر کرشن نے پوچھا، ''رات کیا ہوتی ہے؟'' تو ماں نے بتایا کہ ''جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔'' کرشن بھی شاید دنیا کے تمام بچّوں کی طرح تیز اور شرارتی تھا کہ ایک دم آنکھیں بھینچ کر کہنے لگا، ''اب تو مکھن دو۔ اندھیرا ہو گیا ہے!''

شاید دنیا کی تمام ہی مائیں کم از کم اپنی اولاد کے لیے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہ ایسے کہ آوارہ گرد اپنے کچھ پڑھے لکھے رشتہ داروں اور دوستوں سمیت دیہاتی (حرف عام میں جاہل) عورتوں کے اپنے بچے کو کمر پر (کمر کے دونوں جانب بچے کی ٹانگیں لٹکا کر) چڑھا کر چلنے پر

ہنستا رہا ہے لیکن ایک ''گنوار'' رشتہ دار خاتون نے اس وقت سب کو لاجواب کر دیا جب انہوں نے بے نظیر بھٹو کو ان کی سابقہ حکومت کے دوران امریکہ یاترا میں اپنے بیٹے بلاول کو اسی طرح کمر پر لٹکائے جہاز سے اترتے ہوئے کی تصویر دکھائی! ایسا لگ رہا تھا کہ یہ خاتون کسی ملک کی وزیر اعظم نہ ہوں بلکہ حیدرآباد کے ٹنڈو ولی محمد میں بھٹہ کھاتے ہوئے بیٹی کو کمر پر لٹکانے والی ''خیر النسا جعفری'' ہوں!

بات سے بات تو نکلتی رہے گی، ہم چل کر دوبارہ ریل گاڑی کا سفر کرتے ہیں۔ آوارہ گرد کو پانی سے ویسے ہی خوف آتا ہے لیکن جب یہ ریل گاڑی دریائے سندھ پر اٹک پُل سے گزرتی ہے تو اچھا خاصہ سورما بھی دہل جاتا ہے، لیکن جائے بھی کہاں؟ دونوں طرف سینکڑوں فٹ نیچے اپنی پوری طاقت سے بہنے والا دریا۔ یہ جگرا تھا بدر ابڑو کا، جس نے کشتی کے ذریعے دریائے سندھ کا سفر کیا۔ ہمارا یار بدر ابڑو حلیے اور شکل سے تو روز صبح کسی مزار کی دہلیز چوم کر سانس لینے کی بھی اجازت طلب کرنے والا لگتا ہے لیکن اندر سے انتہا درجے کا ایڈونچرسٹ ہے۔ کبھی جنرل ضیا کی مارشل لا میں کمیونسٹوں کے ساتھ جیل جانے کا ایڈونچر کرتا ہے تو کبھی کشتی کے ذریعے دریائے سندھ کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کرتا ہے اور اگر اس سے بھی کچھ نہ بگڑے تو سندھی رسالہ شائع کرنے کا ایڈونچر کرتا ہے!

سو بات ہو رہی تھی پشاور سے راولپنڈی تک ریل کے سفر کی۔ ریل کا یہ سفر بھی مستنصر حسین تارڑ کے اس کالم کی طرح ہو گیا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اسکول کے دنوں میں ان کے ایک ہم جماعت کو فقط ایک مضمون ''میرا بہترین دوست'' یاد تھا۔ سو کسی بھی موضوع پر مضمون لکھنے کا اُسے کہا جاتا وہ اسی موضوع پر لکھ کر دم لیتا تھا۔ اساتذہ بھی اس سے تنگ آ گئے، اُس سے قرآن شریف پر مضمون لکھنے کو کہا گیا تو اُس نے لکھا، ''قرآن شریف آخری آسمانی کتاب ہے جو ہمارے رسولؐ پر نازل ہوئی۔ میرا بہترین دوست غلام رسول قرآن حفظ کر رہا ہے۔ غلام رسول کے والد سرکاری ملازم ہیں۔ اُس کے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ غلام رسول ......غلام رسول...... غلام رسول......!''

بالآخر ایک دن استاد نے اچھی خاصی پٹائی کرنے کے بعد اُس سے ہوائی جہاز کے سفر پر مضمون لکھنے کو کہتے ہوئے کہا، ''اب دیکھوں کس طرح غلام رسول کا ذکر کرتے ہو!''

لیکن تارڑ صاحب کا ہم جماعت بھی شاید آوارہ گرد جیسا ہی تھا۔ مضمون شروع کیا کہ

''پچھلے ہفتے میں اپنے والد اور والدہ کے ساتھ جہاز کے ذریعے لاہور سے کراچی گیا، سامان وغیرہ جمع کرا کے ہم آ کر اپنی نشستوں پر بیٹھے۔ جہاز آہستہ آہستہ دوڑ کر اوپر اڑنے لگا۔ گھر، راستے اور میدان نظر آ رہے تھے۔ ایک راستے سے میرا بہترین دوست غلام رسول گزر رہا تھا۔ غلام رسول کے والد سرکاری ملازم ہیں۔ غلام رسول کے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ غلام رسول ......غلام رسول...... غلام رسول......!''

سو آوارہ گرد جان چھوڑے تو سفر ختم ہو۔ پشاور سے راولپنڈی تک ریل کے سفر میں پہاڑوں، دریاؤں اور درّوں کے سوا دو باتوں نے آوارہ گرد کا دھیان مبذول کرایا۔ ایک تو سندھ کے برعکس یہاں کی عورتیں سفر کے دوران اچھی خاصی سرگرم نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے ہاں سندھ میں عورتیں ویسے ہی بھیڑ بکریاں، سفر میں تو بالکل بارش میں بھیگی ہوئی مرغیاں بن جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حالیہ بارشوں کے نتیجے میں پہاڑوں اور میدانوں پر اتنی گھاس اُگ آئی تھی کہ بھینسیں، گائیں، بکریاں اور اونٹ کھا کھا کر مست ہو گئے ہیں۔

ہاں، ایک اور بات یاد آئی کہ اس سفر کے دوران ایک جگہ ریل گاڑی زوردار بریک لگا کر رک گئی۔ پتہ چلا کہ کسی خانہ بدوش پٹھان خاندان کا اونٹ پٹڑی پر اگنے والی گھاس کھانے میں اتنا مست تھا کہ ریل کی آواز بھی اُسے متوجہ نہیں کر پائی۔ ریل رُکی تو پٹھان نے بھی لاٹھی سے اپنا اونٹ ہنکایا۔ ہماری بوگی میں سفر کرنے والے کچھ یورپی سیّاح تو اس منظر کی تصویریں کھینچنے لگے اور آوارہ گرد کراچی ریڈیو کے ادبی پروگرام ''رسالہ'' میں فقیر محمد لاشاری کے پڑھے ہوئے کالم'' ایک گدھے کی واردات'' یاد کر کے مسکرانے ر افسردہ ہونے لگا۔ لاشاری کا یہ گدھا بھی بندر روڈ کے بیچوں بیچ ایک چوک پر سعادت حسین منٹو کے'' ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے ہیرو کی طرح، پیر جما کر کھڑا ہو گیا تو وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور لاکھوں روپوں کی گاڑی والے اس سے بچ بچا کر دائیں بائیں ہو کر گزرنے لگے!

# حیدرآباد کے خالی رستے اور ''کھپچو کنونشن''

کئی برس بعد آوارہ گرد کو حیدرآباد کے راستوں پر پوری رات آوارہ گردی کرنے کا اتفاق ہوا۔ بچپن اور جوانی کے ابتدائی برسوں کی راتوں کے برخلاف آوارہ گرد کو اس مرتبہ شہر بالکل مختلف لگا۔ کہاں دسمبر کے آخری دنوں میں بھی شہر کے راستوں پر گھومتے پھرتے نوجوانوں اور ادھیڑ عمر والوں کے ہجوم اور کہاں گرم رات میں بھی خالی اور ویران راستے۔ جن لوگوں نے اسّی کی دہائی کے پہلے نصف تک حیدرآباد کی راتیں دیکھی ہوں گی وہ بھی یقیناً آوارہ گرد کی طرح ناسٹلجیا کے شکار ہوکر غمگین ہوں گے۔

آوارہ گرد نے ۷۰ء کی دہائی کے آخری نصف سے لے کر ۸۰ء کی دہائی کے ابتدائی نصف تک حیدرآباد میں راتوں کی آوارہ گردی کا مزہ لیا ہے۔ عجب دن تھے وہ بھی۔ رات کو آٹھ نو بجے لوگ گھروں سے نکلنا شروع کرتے تھے تو پو پھٹے سے پہلے گھروں کا رُخ کرنا تو جیسے حیدرآباد کے ضابطۂ اخلاق میں ہی نہیں تھا۔ دیر سے گھر آنے پر ہر رات ماں/بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر بھی، مجال ہے کہ دوسری شب معمول میں کوئی تبدیلی آئے۔

آوارہ گرد نے اپنی زیادہ تر آوارہ گردی ایک صحافی اور شاعر دوست کے ساتھ کی ہے۔ رات کو ساڑھے گیارہ، بارہ بجے تک گل سینٹر کے کسی ہوٹل پر ایک اسپیشل چائے سے دو کپ بنا کر پیتے ہوئے یہاں وہاں کے قصّے کرنے کے بعد جتوئی چوک پر ڈیرہ جمانا معمول تھا۔ اُن

دنوں نہ ہوٹل پر بیٹھے ہوئے ڈر لگتا تھا اور نہ جتوئی چوک پر بیٹھنے پر پولیس پکڑتی تھی۔

جتوئی چوک کے بعد رخ ہوتا تھا کیفے فردوس کا۔ گل سینٹر کے ہوٹل نوجوان سندھی دانش وروں سے بھرے ہوتے تھے تو کیفے فردوس پر زیادہ تر اردو بولنے والے دانش وروں کا ہجوم ہوتا تھا تاہم یہ تقسیم لسانی بنیادوں پر نہیں تھی۔ حیدر آباد میں تو یہ سلسلہ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء سے شروع ہوا پھر بھی یہ تقسیم حیدر آباد میں کبھی بھی مکمل طور پر نہیں رہی ہے۔

گھنٹے دو گھنٹے کیفے فردوس پر اپنی پرائی شاعری/ افسانوں پر بے لاگ تبصروں کے بعد راتوں کے آوارہ گرد مارکیٹ ٹاور کے قریب ''کھڈرا گلی'' (ہیجڑہ گلی) کے ہوٹلوں کا رخ کرتے۔ ان ہوٹلوں پر شہر اور قرب وجوار کے عام لوگ بیٹھ کر وقت گزارتے تھے۔ وہاں چرس کے موالی، نصف شب تک ملازمت کرنے والے یا غیر دانش ور آوارہ گرد بھی اپنی دنیا سجائے بیٹھے رہتے۔

محرم کے دس دن یوں تو ماتم کے لیے ہوتے ہیں لیکن اسّی کی دہائی کے آخری برسوں تک حیدر آباد ان دس دنوں کو عجیب طریقے سے مناتا جاتا تھا۔ کیا شیعہ، کیا سنی، کیا آغا خانی، کیا ہندو، ہر ایک سیاہ کپڑے پہن کر راتوں کو ذوالجناح کے جلوسوں میں یا اپنے طور پر ٹولا بنا کر راستے ناپتا تھا۔

یار، کیا پوچھتے ہو حیدر آباد کے ان دنوں کا! نہ جانے کس کی نظر لگ گئی شہر کو۔ نظر بھی ایسی کہ آوارہ گرد کی حالیہ آوارہ گردی میں اُسے پوری رات میں فقط چار پانچ لوگ ٹکرائے۔ وہ بھی قریب سے گزرتے ہوئے آوارہ گرد کی طرح ٹھٹک رہے تھے۔ اُس رات ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے آوارہ گرد کے ''ترقی پسند اور جدلیاتی مادّیت کے پیروکار دوستوں'' کو غیر سائنسی لگنے والی جنوں اور بھوتوں کی کہانی حقیقت کا روپ دھار کر شہر پر مسلط ہوگئی ہو۔

ویسے بھی لگتا ہے کہ سندھ سے راتوں کی آوارہ گردی کا کلچر ہی ختم ہوگیا ہے، ورنہ کراچی میں بھی برنس روڈ، رنچھوڑ لائین، لسبیلہ اور کھارا در کے ہوٹل اور دکانیں پوری رات کھلی رہتی تھیں۔ اب تو بس کھارا در اور لسبیلہ پر ہی کچھ ہوٹل کھلے ہوتے ہیں اور اگر آوارہ گرد جیسے کسی شب خور جانور کے پاس رات کو سگریٹ ختم ہوجائیں تو پھر وہ اُسی طرح دیواروں سے سر ٹکرائے گا جیسے جنرل ضیا کے مارشل لا میں رمضان کے مہینے کے دوران دن میں سگریٹ کے موالی حیران وپریشان گھومتے تھے۔

راتوں کے آوارہ گردوں کے لیے اسلام آباد میں ایک لفظ مشہور ہے ''کھپچو''۔ دراصل

پنجابی میں کھیچو اُس کتّے کو کہا جاتا ہے جو پوری رات گزرنے کے بعد بھی کوئی ساتھی حاصل کرنے میں ناکامی پر دم ہلاتا ہوا، رات کے پچھلے پہر راستوں پر تنہا بھٹکتے ہوئے ہر ایک پتھر اور ستارے پر بھونکے۔

اسلام آباد میں آوارہ گرد کے کچھ کھیچو دوستوں کے پاس تجویز ہے کہ کوئی آل پاکستان کھیچو کنونشن منعقد کیا جائے اور اُس میں مقامی/ دیسی آوارہ گردوں کو ''مندوب'' کے طور پر اور برادری کی غیر ملکی شہریت رکھنے والوں کو ''مبصر'' کے طور پر بلایا جائے کیوں کہ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ سے گھوم کر آنے والے ایک کھیچو حسن مجتبیٰ کا کہنا ہے کہ آوارہ گرد کی برادری وہاں بھی موجود ہے۔

بس یار! آوارہ گرد کی یہی تمنا ہے کہ لاہور، اسلام آباد اور جرمنی، سوئٹزر لینڈ کی طرح اَن گنت شہروں، ملکوں میں موجود راتوں کی رونق کے صدقے کراچی اور حیدر آباد کی رونقیں بھی لوٹ آئیں اور آوارہ گرد ایک بار پھر راتوں کو دیر تک راستوں اور ہوٹلوں پر اپنے ہم عمر ساتھیوں سے جھگڑے بھی کرے اور دوستیاں بھی!

# ''بانو تیرے بُندے'' جدوجہدِ لاحاصل

آوارہ گرد کے دوست حسن مجتبٰی نے حال ہی میں اپنے ایک کالم میں پوٹھوہاری لوک گیت کا حوالہ دیا ہے کہ ''چھورے مر گئے کمایاں کر کے، بانو تیرے بُندے نہ بنے''

زندگی کی انت تک تگ ودو کے باوجود بانو کے بندے نہ بن سکنے والی بات آوارہ گرد کے لیے ایک نئے کرب کا روپ دھار کر آئی ہے۔ ہوسکتا ہے نہ مستقبل کے بہتر ہونے پر یقین رکھنے والوں کو یہ بات پسند نہ آئے لیکن آوارہ گرد کو یہ مصرع پڑھ کر قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کا وہ منظر یاد آیا جب اپنے دور کے دانا و دیار تھی اور جنگ کے نتیجے میں مصوری کرنے والی انگلیاں کٹوانے والے نرتک اور کلاکار گوتم نیلمبر نے دریا کے دوسرے کنارے پر اپنے جیسے ہی ذہین ہری شنکر کو دیکھ کر'' بھائی ہری شنکر! ٹھہرنا، آتا ہوں'' کہہ کر تیر کر پار کرنے کے لیے دریا میں چھلانگ لگائی تو بیچ منجدھار پانی کا تیز دھارا اسے ڈبونے لگا اور اُس نے دریا میں اُبھرے ہوئے ایک ٹیلے پر ہاتھ مارا تو انگلیاں نہ ہونے کے وجہ سے ٹیلے کو پکڑ نہیں پایا اور دریا کا ہمیشہ قاتل بننے والا پانی گوتم جیسے کلاکار کو ایسے نگل گیا جیسے کوئی گھاس پھونس ہو۔

آوارہ گرد، پوٹھوہاری لوک گیت کے تخلیق کار اور عینی کے کرب میں ارنسٹ ہیمنگوے بھی اپنے ناول ''بوڑھا اور سمندر'' کے ذریعے شریک ہوتا ہے، جس میں ایک بوڑھا مچھیرا کئی دن تک خراب موسم ہونے پر سمندر میں کشتی اُتارنے میں ناکام ہونے اور تین دن تین راتیں

سمندری طوفان سے نبرد آزما ہونے کے بعد جب وہ ساحل پر پہنچا تو اس کی شکار کی ہوئی بڑی مچھلی کو چھوٹی مچھلیاں کھا چکی تھیں اور ھیمنگوے کے بوڑھے مچھیرے کے نصیب میں صرف ڈھانچہ ہی بچا۔

سب کچھ گنوانے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ کرنے کا دکھ آوارہ گرد نے ایک انگریزی فلم "Indecent-Proposal" کے ایک منظر میں بھی محسوس کیا۔ جب اس فلم کا آرٹسٹ ہیرو اپنے آئیڈیل گھر کو نیلام ہونے سے بچانے اور اُسے مکمل کرنے کے لیے اپنی محبوب بیوی کو ایک ارب پتی کے ساتھ ایک رات سونے کی اجازت انتہائی ذہنی عذاب اور بیوی کی اس دلیل کے بعد دیتا ہے کہ ''وہ میرے ساتھ فقط Sex کرے گا لیکن میری محبت اور دل اس کے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے ہیں'' لیکن جب وہ ایک رات کے لیے دل اور محبت کے بغیر جسم کا معاوضہ لے کر متعلقہ کمپنی پہنچتے ہیں تو پتہ لگتا ہے کہ انہیں دیر ہو چکی ہے اور وہ اب اپنے سپنوں اور خوابوں کے مطابق بنائے ہوئے گھر کے مالک نہیں رہے اور سب سے بڑا کرب یہ کہ اس گھر کا خریدار کوئی اور نہیں بلکہ وہی ارب پتی ہے!

اپنا آئیڈیل پانے کے لیے انسان موت کے پل تک تگ ودو کرنے اور محبوب شوہر کے بجائے کسی اور کے ساتھ سونے کا عذاب تو قبول کرسکتا ہے۔ لیکن اتنی بڑی بھینٹ کے بعد حاصل ہندو دھرم کے مطابق راجیو گاندھی جیسے طویل القامت شخص کا بھی کریا کرم کے بعد مٹی اور ہڈیوں کا مٹھی بھر چورا ہو تو پھر واقعی کسی کا اپنے حواسوں سمیت زندہ رہنا ممکن نہیں۔ آوارہ گرد کو ایک دوست نے بتایا تھا کہ پاکستان کے مہان سنگیت کار خواجہ خورشید انور سے سنگیت کے ایک ماہر نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ ان کی طربیہ موسیقی میں بھی ایک آہ ہے، سو کیوں؟ تو خواجہ خورشید انور نے جواب دیا تھا کہ زندگی کے ایک مرحلے پر ان کے من پر ایک گھاؤ لگا تھا، وہ یہ کہ جب وہ بھگت سنگھ کی دہشت گرد پارٹی میں کام کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تو تشدّد ہونے پر کچھ راز انتظامیہ کو بتا بیٹھے تھے۔ من پر چھانے والا یہ دکھ اُن سے طربیہ موسیقی میں بھی آہ بھرواتا ہے۔ فن کے معراج پر پہنچنے اور تقریباً تمام تر دنیاوی خوشیاں حاصل ہونے کے باوجود بھی اگر خواجہ خورشید انور کو جوانی کا ایک زخم دُکھی کرسکتا ہے تو پھر حساس من رکھنے والے شیر محمد مری اپنی اتنی ساری جدوجہد کو شیواز ریگل کی بوتل، امریکی اسکالرشپ اور پاکستان ائیر فورس کے جنگی جہاز کے ذریعے کابل سے اسلام آباد آمد میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھ کر کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں؟

نہ جانے کیوں'' چھوڑے مر گئے کمایاں کر کے، بانو تیرے بندے نہ بنے'' کے الفاظ آوارہ گرد کے ذہن میں اٹک گئے ہیں اور نہ جانے یہ کب تک ذہن میں موجود رہیں، شاید جب تک آوارہ گرد کو پتہ لگے کہ بانو کے بندے اب بھی بن سکتے ہیں کیوں کہ بانو کے بندوں کا آوارہ گرد کی زندگی سے ایک گہرا تعلق ہے۔

# مسکراہٹوں کے لاہوری سوداگر

فلسطینی شاعر توفیق زیاد نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے کہ ''میں اپنی نصف زندگی اس کو دان کردوں گا جو کسی روتے ہوئے بچّے کے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے۔'' آزاد فلسطینی ریاست میں یاسر عرفات کی پہلی مرتبہ آمد پر استقبال کرنے کے بعد اپنے شہر واپسی کے دوران سڑک کے حادثے میں ہلاک ہونے والے نابلس شہر کے میئر توفیق زیاد کو روتے ہوئے بچوں کے چہرے پر مسکراہٹ لانے والوں سے ملنے کا جانے اتفاق ہوا کہ نہیں البتہ آوارہ گرد کو یہ کارنامہ سرانجام دینے والوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔

لاہور میں رہنے کے دوران آوارہ گرد کی دوستی فرنٹیئر پوسٹ اخبار کے کارٹونسٹ اسد اور خالد سے ہوئی۔ یہ دونوں یار جتنے اچھے کارٹون بناتے ہیں اتنی ہی مہارت سے پتلیاں بھی نچاتے ہیں۔ آوارہ گرد نے ان پتلی تماشوں میں بچّوں اور بڑوں کو یکساں طور پر Involve ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کے تماشے میں تین چار پتلیاں ہوتی ہیں اور پس منظر میں ٹیپ ریکارڈ پر چلنے والی بچوں کی کہانی پر وہ پتلیاں نچاتے ہیں۔

چار پانچ لڑکوں اور لڑکیوں کا یہ گروپ ۱۹۸۷ء سے ہر ہفتے الحمرا کلچرل کامپلکس میں شو کررہا ہے۔ اس گروپ کے ایک دوست کے بہ قول اب یہ شو ان کی زندگی کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔ اگر کسی دن پروگرام کرنے کا موڈ نہیں ہوتا تو ایک دم کسی بچّے کا چہرہ نظروں کے سامنے

آ جاتا ہے اور وہ ہر صورت میں شو کرنے کے لیے پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ دوستوں کے بہ قول آوارہ گرد 'Nostalgia' کا شکار رہتا ہے۔ واقعی، کم از کم پہلی مرتبہ لاہور میں پتلی تماشہ دیکھ کر آوارہ گرد کو بچپن میں دیکھے ہوئے وہ پتلی تماشے یاد آئے جن میں چار پائی کھڑی کر کے، ان کے پیچھے بازیگر بیٹھ کر ڈوریاں چلاتا تھا۔

ایک مرتبہ پتلی تماشہ چلتے ہوئے آوارہ گرد سوچتا رہا کہ کیا یہ پتلیاں ہم خود ہیں جن کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور اس کی ہی مرضی کے مطابق ہم چلتے پھرتے ہیں اور جب وہ چاہے ہماری حرکت بند کر دے؟ جن لوگوں نے راج کپور کی فلم ''میرا نام جوکر'' دیکھی ہوگی انہیں یاد ہوگا کہ اس فلم کا ہیرو اپنے اسکول کے ایام میں اپنی ایک استانی پر عاشق ہوتا ہے اور اپنی سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ ''جوکر'' اُسے تحفتاً دیتا ہے جو اس کے باپ نے مرتے ہوئے یہ کہہ کر دیا تھا کہ ''یہ سنبھال کر رکھنا۔ اس کی طرح دنیا کو ہنسانا لیکن اپنا دکھ کسی پر ظاہر نہ کرنا۔'' راج کپور جیسے ذہین اور دانا ڈائریکٹر، اداکار نے اپنے پورے فلمی کیریئر کے دوران جیسے توفیق زیادکی خواہش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

اپنی استانی پرُ عاشق ہونے والی بات پر آوارہ گرد کو میکسم گورکی یا چیخوف کا افسانہ یاد آ رہا ہے اس میں بھی ایک طالب علم اپنی استانی پر عاشق ہوگیا تھا! لیکن یہ یورپی عاشق ہمارے برصغیر کے عاشق (راج کپور) کے مقابلے میں انتہائی کٹھور تھا۔ افسانہ کا طالب علم کردار یہ سوچتا رہتا ہے کہ استانی تو عمر میں اس سے بڑی ہے اس لیے وہ اُس سے شادی نہیں کر سکے گا۔ طالب علم کے جوان ہونے کے بعد ایک دن استانی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کا سابق طالب علم یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب ایک دن وہ اپنی استانی سے بڑا ہوسکتا ہے!

برصغیر کے رنگ ہی اپنے ہیں۔ یہاں پتلیاں ہیں، ناٹک ہیں، نرت ہے، دیوی اور دیوتا ہیں۔ اسد اور خالد کے پتلی تماشے کی بات تو چلتی رہے گی لیکن فی الوقت آوارہ گرد کو مغرب میں پل کر بڑی ہونے والی وہ رشتہ دار/ دوست یاد آ رہی ہے، جس نے کافی عرصے کے بعد یہاں آنے پر یہاں کا مشاہدہ کر کے کہا تھا کہ ''عجیب بیک ورڈ خطہ ہے، جہاں محبوب کو گنگا میّا میں پانی رہنے تک جینے کی دعائیں دی جاتی ہیں یا بیٹوں اور بھائیوں کو مائیں اور بہنیں تو کیا بھکاری بھی سات بیٹوں کی دعائیں دیتے ہیں۔''

جب یہ خاتون واپس ''اپنے'' دیس لوٹ رہی تھی تو یہاں کے ''بیک ورڈ خطے'' کی بیک

ورڈ عورتوں'' سے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ آوارہ گرد کے اُسے یہ یاد دلانے پر کہ وہ ''ایڈوانس علاقے'' سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اُسے رونا نہیں چاہیے، اس نے صرف ایک جملہ کہا تھا کہ نہ جانے کون سی کشش ہے جو یہاں سے جانے نہیں دیتی اور رخصت ہونے پر احتجاج کرتی ہے اور یہ آنسو اس احتجاج کا اظہار ہیں۔

آوارہ گرد کے خیال میں برصغیر کی ہر گلی، ہر بستی میں ایک پر اسراریت ہے جو آپ کو اپنی بانہوں میں بھر لیتی ہے۔ آوارہ گرد کے پُتلی باز دوست اسد نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ لاہور میں ایک شخص رہتا تھا جو اپنے بچپن میں خالص اردو بولنے والے کسی علاقے سے وہاں پہنچا تھا۔ یہ شخص بڑھاپے میں سخت بیمار پڑ گیا تو اپنے ایک دوست سے یہ کہہ کر گاڑی منگوائی کہ مرنے سے پہلے وہ جی بھر کر لاہور دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی گاڑی چلانے والے کا کہنا تھا کہ اُس دن اس نے لاہور کی ہر گلی، روڈ اور علاقہ کو دو دو، تین تین مرتبہ دیکھا اور جگہ جگہ گاڑی رکوا کر کسی جگہ، پارک یا روڈ کو اس طرح گھور کر دیکھتا رہا جیسے اُس میں اپنا ماضی تلاش کر رہا ہو یا اُس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں گپ شپ کر رہا ہو۔ بس یار! برصغیر کے یہی رنگ ہیں جن کی وجہ سے جو بھی یہاں آیا سو یہیں کا ہو گیا۔

بات ہو رہی تھی آوارہ گرد کے کارٹونسٹ اور پتلی تماشہ کرنے والے دوستوں اسد اور خالد کی۔ یہ دونوں یار کہتے ہیں کہ کوئی بھی نیا شخص ''ان کی آنکھوں کے فوکس'' میں پورا آ گیا تو اُس سے ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ آوارہ گرد بھی دوستی کرنے کے لیے یہی پیمانہ مقرر کرتا ہے کہ پہلی ملاقات کے پہلے پل میں ہی فیصلہ کیا جائے گا کہ سامنے والے بندے سے دوستی رکھی جائے گی یا نہیں۔ سو اسد اور خالد کے ساتھ بھی آوارہ گرد کی دوستی ہو گئی۔

اسد کے والدین ہندوستان سے نقل مکانی کر کے آئے تھے لیکن وہ پنجابی ایسے بولتا ہے جیسے اُستاد دامن یا بابا نجمی بولتے ہیں۔ خالد کا تعلق سوہنی کے دیس گجرات سے ہے اور وہ بھی سوہنی کی طرح اپنوں کے لیے چناب میں چھلانگ لگانے سے نہیں ہچکچاتا۔ خالد اپنے کارٹونوں سے یوں انصاف کرتا ہے کہ ایڈیٹر کہے گا کہ نواز شریف کے فلاں بیان پر کارٹون بنانا ہے تو وہ اپنی تمام تر نواز مخالفت اس کارٹون میں ڈال دے گا۔ اُس کے کچھ مزید پسندیدہ اہداف الطاف حسین، جام صادق علی اور پولیس والے ہیں۔

اسد ہے تو وہاں جونیئر کارٹونسٹ لیکن وہ بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اپنے ٹارگیٹ کی شکل

ایسے بگاڑے گا کہ اپنی تمام تر نفرت کے باوجود آپ کو کسی حد تک جنرل ضیا پر بھی رحم آ جائے گا۔ خالد کی طرح نیشنل کالج آف آرٹس سے ڈگری یافتہ اسد پر کچھ عرصہ قبل مجسمے بنانے کا جنون چڑھا۔ یہ جنون ایسا لگا کہ رات کو تین چار بجے تک لاہور پریس کلب میں بیٹھنے والا اسد اخبار کی ڈیوٹی ختم ہوتے ہی مجسمے بنانے میں جُت جاتا تھا۔

مٹی کے چھوٹے چھوٹے مجسموں میں جان ڈالنے والا اسد اور شکلیں بگاڑ کر کارٹون بنانے والا خالد نوجوانوں کی اس نسل میں سے ہیں جس نے اپنے شعور کی عمر کو پہنچنے پر ملک میں فوجی راج دیکھا اور اس سے مزاحمت کا ذریعہ مصوری، کارٹونوں، مجسموں اور پتلیوں کو بنایا۔

# نیٹی جیٹی کا ’’جادو‘‘

کسی ٹی وی پروگرام میں انور مقصود نے کراچی کے رنگ دکھاتے ہوئے نیٹی جیٹی پُل سے متعلق ایک اچھوتی بات کہی کہ سمندر پر بنے ہوئے اس پُل پر پہلے لوگ تفریح کے لیے آتے تھے لیکن اب وہاں بیروزگار نوجوان آتے ہیں اور ان کے پاس ایسا جادو ہے کہ آنکھ جھپکتے ہی ’’نظروں سے اوجھل‘‘ ہوجاتے ہیں!

کراچی پورے ملک کے لوگوں اور بالخصوص نوجوانوں کے لیے روزگار کا ایک سراب ہے لیکن یہاں بھی روزگار حاصل کرنے میں ناکام ہونے والے نوجوان یا تو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوّث ہوجاتے ہیں یا پھر نیٹی جیٹی کے پُل سے کود کر زندگی کا چراغ گل کر دیتے ہیں۔ آوارہ گرد نے نیٹی جیٹی کی اس پُل پر پکنک مناتے ہوئے تو کسی کو بھی نہیں دیکھا البتہ شیعہ عورتوں کو امام جعفر صادق کے نام کاغذ اور دیوں پر عرضیاں بھیجتے اور دو نوجوانوں کو خودکشی کرتے ضرور دیکھا ہے۔

نیٹی جیٹی کے پُل کے کئی رنگ ہیں۔ عاشورہ کے دن یہاں اماموں کی یاد میں نکالے جانے والے تعزیے ٹھنڈے کیے جاتے ہیں۔ قرآن اور دیگر مقدس تحریروں کے ضعیف اوراق یہاں غرقِ آب کیے جاتے ہیں۔ یہاں سے ہی شیعہ عورتیں امام جعفر کے نام عرضیاں بھیجتی ہیں تو یہیں سے کئی زندگیاں اپنا خاتمہ کرتی ہیں۔ کراچی پہنچنے والے بیروزگار اور حسّاس نوجوانوں

سے ہونے والی زیادتیوں کا بھرپور اظہار اردو کے ایک قلندر مصنف تاج حیدر نے اپنے ایک ٹی وی ڈرامے ”غلام رسول بلوچ اور مجموعی قومی پیداوار“ میں کیا ہے۔ مجموعی قومی پیداوار کا بیروزگار غلام رسول بلوچ بھی جس دفتر میں جاتا اُسے یہی بتایا جاتا کہ دراصل اُس کے باروزگار ہونے کا مطلب کسی نہ کسی طرح ملکی مفادات کے خلاف ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں اُسے بتایا گیا کہ اگر ملازمت ملی تو وہ شادی کرے گا اور شادی کے نتیجے میں اُس کے ہاں بچّے پیدا ہوں گے اور پہلے سے ہی موجود کثیر آبادی میں مزید اضافہ ملک کو اور زیادہ بحران کا شکار کر دے گا۔ محبِّ وطن غلام رسول کسی بھی صورت میں ملک کو بحران میں دیکھنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر جب ایک بینک کے صدر کے ہاں ملازمت کے لیے گیا تو اُس نے بتایا کہ ملازمت ملنے کی صورت میں اُسے تنخواہ ملے گی اور جیب میں رقم آنے کی صورت میں وہ خریداری کرے گا اور اس سے مہنگائی میں اضافہ ہوگا۔ کیا وہ چاہے گا کہ مہنگائی ہونے کی وجہ سے وہ مجموعی قومی پیداوار میں کمی کا سبب بنے؟ بالآخر ایک دن اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے کہ گزشتہ روز کراچی کی نیٹی جیٹی پُل پر ایک نوجوان نے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ وہ کسی بھی صورت میں ملک کے لیے نقصان دہ نہیں ہونا چاہتا اور دو مرتبہ پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کر کے پل سے چھلانگ لگا کر بہ قول انور مقصود پر جادو کے زور سے گم ہوگیا۔

خودکشی پر آوارہ گرد کو یاد آیا کہ بی بی سی ریڈیو سے دریائے سندھ پر اپنے پروگرام ”شیر دریا“ میں رضا علی عابدی نے شاید گوجرانوالہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس شہر میں دولت اور روزگار کی بہتات ہے اس لیے یہاں کے نوجوان تعلیم پر دھیان نہیں دیتے اور میٹرک کا نتیجہ ظاہر ہونے والے دن گوجرانوالہ میں دریا کے پُل پر پولیس تعینات کرنی پڑتی ہے تاکہ میٹرک میں فیل ہونے والے طلبہ کو ”جادو دکھانے“ سے روکا جائے۔

آوارہ گرد کے شہر کے قریب جامشورو پُل بھی نوجوانوں کے ”جادو“ کی وجہ سے مشہور ر بدنام رہا ہے۔ اس پُل سے خودکشی کرنا طویل عرصے سے ایک معمول ہے۔ علامہ آئی آئی قاضی، ماٹھینو اوٹھو اور عرفان مہدی جیسے دانش ور بھی یہیں سے......

کچھ سال قبل تو اس پُل سے تقریباً روز ہی خودکشی کی ایک واردات ہوتی تھی۔ اس میں اکثریت اُن ٹین ایجرس کی تھی جو حیدرآباد کے قدامت پسند معاشرے میں اپنے محبوب سے مل نہیں پاتے تھے۔ اس صورت حال کو روکنے کے لیے مقامی انتظامیہ نے ایک مرتبہ پُل پر پولیس

کا پہرہ بٹھایا لیکن ہوا یہ کہ ان پولیس والوں میں سے بھی ایک نے وہاں ''جادوئی تماشہ'' دکھا دیا۔

آوارہ گرد کا خیال ہے اور ہوسکتا ہے کہ کوئی اس سے اختلاف بھی کرے کہ جامشورو پُل کے المنظر ہوٹل کے ساتھ کنارے پر پانی کا دھارا کچھ ایسا ہے کہ کچھ لمحے پانی کو گھور کر دیکھنے سے پانی اپنی طرف کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ماحول شیخ ایاز کی نظم ''تم بھی پانی، میں بھی پانی، آؤ مل جائیں، ایک دوجے سے جیسا ہوجاتا ہے۔

جو خودکشی کی بات نکلی ہے تو آوارہ گرد کو کچھ سال قبل جاری ہونے والی ایک عالمی رپورٹ یاد آرہی ہے، جس کے مطابق ملکی سطح پر خودکشی کرنے کا سب سے زیادہ رجحان سویڈن میں ہے۔ سویڈن میں تو آوارہ گرد کے ایک دوست ڈاکٹر پرشوتم نے بھی خودکشی کی تھی۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا تھا کہ خودکشی کا سب سے زیادہ شکار تیسری دنیا کے نوجوان ہوتے ہیں۔ تیرہ سے پینتیس سال کے یہ نوجوان تیسری دنیا کے اپنے معاشروں سے ذہنی طور پر آگے نکل جاتے ہیں، پھر کبھی یہ اپنی زندگی ختم کرتے ہیں تو کبھی لبنانی لڑکی ثنا کی طرح گاڑی میں بارود ڈال کر دشمن کے کسی کیمپ پر دھاوا بول دیتے ہیں۔

کچھ سال ہوئے، آوارہ گرد کے کچھ دوستوں پر بھی خودکشی کرنے کا جنون سوار ہوا تھا۔ انہوں نے تو غیر اعلانیہ ''مشترکہ خودکشی کلب'' بھی بنایا تھا لیکن وہ طے شدہ دس کی تعداد میں اراکین جمع نہیں کر پائے اور محض سات افراد کی خودکشی پر رضا مندی کے بعد یہ گروپ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔ اس گروپ کے تقریباً تمام افراد اب اپنی اپنی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ کچھ شادی کرکے بیوی بچوں کے لیے کولہو کے بیل کی طرح کمانے میں جُٹ گئے ہیں تو کچھ اپنے فوری مسائل حل ہوجانے کی وجہ سے دوبارہ پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

آوارہ گرد کا خیال ہے کہ اس گروپ کے کم از کم دو اراکین سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ کسی دن ''جادو'' دکھا دیں گے۔

آوارہ گرد کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ خودکشی کرنے کے لیے کچھ منٹ کی ہمت درکار ہوتی ہے جب کہ کچھ لمحوں کی ہمت تو ہر ایک میں ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر خودکشی کی دھمکی دی جاتی ہے اور جس پل لمحوں والی یہ ہمت منٹوں میں تبدیل ہوگئی تو ''پھر موسیٰ کلٹی''!

# چائے، روایتیں اور کولڈ کافی

آوارہ گرد غربت اور کڑکی کے دنوں میں بھی چائے پینے کی اپنی ٹھرک کوشش کر کے ضرور پوری کرتا ہے لیکن پچھلے چھ آٹھ سال سے اچھی، کڑک چائے ملنا روز بہ روز محال ہورہا ہے۔ آوارہ گرد کی رائے میں اسّی کی دہائی کے پچھلے نصف کے دوران کراچی اور حیدرآباد میں ہونے والے مہاجر پٹھان فسادات کے بعد طویل عرصے سے ہوٹل چلانے والے پٹھان یا تو مارے گئے یا پھر واپس اپنے ''ملک'' چلے گئے۔ ان کی جگہ پر آنے والے اب کراچی اور حیدرآباد میں چائے پینے والوں سے وہی سلوک کرتے ہیں جو ملکی ترقّی کے ذمّہ دار ان دونوں شہروں کو ترقیاتی منصوبوں سے محروم رکھ کر کرتے ہیں۔ بہ ہرحال آوارہ گرد نے کراچی سے پشاور تک ملک کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر میں چائے ضرور پی ہے۔

چائے کی جتنی اقسام ہیں اُتنے ہی اس کے ذائقے بھی ہیں۔ جہاں تک آوارہ گرد کی یادداشت کام کرتی ہے تو اس نے سب سے پہلے کسی ہوٹل پر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے سات آٹھ سال کی عمر میں چائے پی تھی۔ عید کے دن ملنے والی عیدی اس دن حیدرآباد کے ایک ہوٹل پر اپنے دو دوستوں کو اسپیشل چائے پلانے پر بھی خرچ کی گئی تھی۔

اُن دنوں عید کے دن کے مزے ہی کچھ اور تھے۔ صبح ہی صبح مشین پر بننے والی سفید سویّاں کھا کر، گھر کے کسی بڑے کی سربراہی میں نماز سے فارغ ہو کر لکڑی اور مٹی کے کھلونے خریدے

جاتے تھے۔ اُن دنوں حیدر آباد کے مارکیٹ کے علاقے میں عید کے دن دو تین سو کولہی خواتین یہ کھلونے لاکر فروخت کرتی تھیں۔ اپنے بچپن میں آوارہ گرد عید سے کچھ دن قبل اپنے پڑوس کے ایک گھر میں مشین پر سفید سویاں بننے کا نظارہ گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا۔ یار! آوارہ گرد بھی عجیب بندہ ہے، جسمانی آوارہ گردی کے ساتھ ساتھ اُسے ذہنی آوارہ گردی کی بھی لت لگ گئی ہے!

بات چل رہی تھی چائے کی اور جا پہنچا عید کے پکوانوں اور بچپن پر۔ لیکن کریں بھی تو کیا! بچپن کی یادیں اتنی ہی دلکش ہوتی ہیں کہ ان سے جان چھڑانا آوارہ گرد تو کیا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جگجیت اور چترا سنگھ کی گائی ہوئی غزل ''یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو، بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی، مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون، وہ کاغذ کی کشتی، وہ بارش کا پانی۔'' آوارہ گرد جیسے بے نام شخص سے لے کر شہرت کے بلند ترین مقام پر پہنچے ہوئے کسی وی وی آئی پی تک کو اپنا بچپن یکساں پسند ہے!

آوارہ گرد نے اپنی زندگی میں اچھی/خراب/کڑک/ہلکی اور ہر نام والی چائے مختلف ہوٹلوں اور گھروں میں ضرور پی ہے۔ آوارہ گرد کے تجربے کے مطابق چائے کی زیادہ سے زیادہ اقسام حیدر آباد کے ہوٹلوں پر ملتی ہیں/تھیں۔ حیدر آباد کے ہوٹلوں پر سادہ، دودھ پتی اور اسپیشل جیسی عمومی اقسام کے علاوہ سنگاپوری، جو الطاف شیخ کے بہ قول سنگاپور میں بھی نہیں ملتی، پونیہ، جس میں پونا کپ چائے میں ایک حصہ پتی والا پانی اور تین حصے دودھ ہوتا ہے، پتی والی، جس میں دودھ کم اور پتی کچھ زیادہ ہوتی ہے، ایکسپریس چائے، جس میں پہلے تو پستہ اور بادام ڈالے جاتے تھے اور بعد میں کبھی کبھار مُونگ پھلی کے دانے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔

آوارہ گرد کو کڑک چائے پسند ہے، اس لیے وہ کوشش کر کے ایسے ہوٹل اور گھر تاڑتا ہے جہاں اس کی یہ ضرورت پوری ہو سکے۔ آوارہ گرد کو اس ضمن میں کڑک اسپیشل چائے کراچی کے مہران ہوٹل کی سب سے آخری منزل پر بنے ہوئے المنظر ریسٹورنٹ اور لاہور کے پاک ٹی ہاؤس کے علاوہ دوستوں کے ایک گھر میں بھی ملی ہے۔ آوارہ گرد نے اپنی زندگی کے دوران کسی بھی گھر میں چائے سے نفاست اور پیار بھرا برتاؤ اپنے ان دوستوں کے گھر جتنا کہیں نہیں دیکھا۔ سچ پوچھیں تو آوارہ گرد نے اپنی زندگی میں اچھی چائے کا مستقل معیار بھی اسی گھر میں دیکھا ہے۔ باقی رہی بات لاہور کے پاک ٹی ہاؤس کی تو وہاں صبح سے رات گئے تک دانش وروں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہ نہ جانے کس نے اور کب طے کر دیا ہے کہ دانش ور ہونے کے

لیے کم دودھ والی کڑک چائے پینا بنیادی شرط ہے۔ اس کے علاوہ آوارہ گرد نے دودھ پتی چائے کا بہترین معیار حیدر آباد کی کھڈرا گلی (ہیجڑہ گلی) کے ہوٹلوں میں دیکھا ہے۔

کچھ سال قبل تک تو آوارہ گرد جیسے اکثر ''خالی جیب مست ملنگ'' لوگوں کو مختلف ہوٹلوں پر ایک اسپیشل چائے کا آرڈر دینے پر دو خالی کپ ملتے تھے لیکن اب اکثر ہوٹلوں پر ایک چائے کا آرڈر دینے پر آدھے یا پونے بھرے ہوئے گرم پانی والے کپ/مگ میں ایک ٹی بیگ ملتا ہے۔ آوارہ گرد کو نہ جانے کیوں ٹی بیگ پسند نہیں ہے۔ اس کا سبب شاید دھاگے کو پکڑ کر، چمچ کی مدد سے اس کو نچوڑ نہ سکنے والا نفسیاتی احساسِ محرومی ہے۔ جس طرح ہمارا دوست حسن مجتبیٰ کہتا ہے کہ سندھی وڈیرے/سیاستدان اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں عام طور پر کم ہی جاتے ہیں۔ حسن کا خیال ہے کہ اس کا سبب ہوٹل کے فرش پر پھسل جانے کا ڈر ہے۔

چائے پینے والے چائے کو مختلف طریقوں سے تیار کر کے پیتے ہیں۔ چائے میں زیادہ چینی ڈالنا یا بالکل نہ ڈالنا، کڑک چائے پینا یا ہلکی چائے پینا تو معمول کی باتیں ہیں البتہ آوارہ گرد نے اپنی آوارہ گردی کے دوران چائے کے حوالے سے کچھ دیگر مصروفیات بھی دیکھی ہیں۔

لاہور میں رہنے کے دوران آوارہ گرد کے ایک پبلشر دوست نے اُسے کشمیری چائے پلائی، جو میٹھی ہونے کے بجائے کچھ تُرش تھی۔ کہتے ہیں کہ جواہر لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنی تحریروں میں اس کشمیری چائے کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ آوارہ گرد نے یہ تحریریں تو نہیں پڑھیں کہ اُسے اندازہ ہو سکے کہ انہوں نے یہ تعریف کس حوالے سے کی ہے البتہ چاہے بڑے لوگوں (نہرو اور آزاد) نے کشمیری چائے کی تعریف کی ہو لیکن آوارہ گرد کو یہ چائے قطعی پسند نہیں آئی۔

اہتمام کے ساتھ چائے بناتے ہوئے آوارہ گرد نے ماضی کے ایک قلندر اور تا حال مست ملنگ آوارہ گرد دانش ور شمشیر الحیدری کو بھی دیکھا ہے۔ وہ چائے میں دودھ اور شکر کی ایک مقرّرہ مقدار اس طرح ڈالتے ہیں کہ ہمارے ایک دوست کے بہ قول شمشیر الحیدری چائے کے کپ میں شکر کے دانے بھی گن کر ڈالتے ہیں۔

آوارہ گرد کا ایک حیدر آبادی دوست رات کو سونے سے قبل چائے ضرور پیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر وہ چائے پیے بغیر بستر پر لیٹے گا تو اُسے کسی بھی صورت میں نیند نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس آوارہ گرد کے ایک دوست کی بیوی رات آٹھ بجے کے بعد چائے نہیں پیتی تاہم

وہ تو ٹھہری گھریلو عورت، جس کے پاس رات آٹھ بجے کے بعد کوئی ذہنی کام نہیں ہوتا۔ لیکن آوارہ گرد کا ایک صحافی دوست سہیل سانگی تو اخبار میں رات کی شفٹ میں کام کرتے ہوئے بھی رات کو نو بجے کے بعد کسی صورت میں چائے نہیں پیتا۔ چائے کے معاملے میں آوارہ گرد کو سہیل سانگی کے معاملے سے زیادہ حیرت کبھی نہیں ہوئی کیوں کہ چائے کے لیے عام لوگ تو کیا ٹی وی اشتہاروں میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سُستی ختم کر کے چستی پیدا کرتی ہے۔ اس کا ثبوت ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات سے ملتا ہے جن میں سے ایک میں شوہر چھٹّی والے دن صوفہ پر لیٹ کر اخبار پڑھنے کے بعد آنکھیں موندھ کر کے لیٹا ہوا ہوتا ہے کہ اس کی بیوی آ کر یاد دلاتی ہے کہ انھیں میکے جانا ہے۔ شوہر کے چھٹی والے دن کی سستی کا اظہار کرنے پر وہ چائے کی کیتلی چڑھاتی ہے تو شوہر اُس کی خوش بو سے ہی چست ہو جاتا ہے۔

البتہ آوارہ گرد کا مشاہدہ ہے کہ تمام شوہر اپنی بیویوں کی ہر فرمائش چائے پینے کے بغیر ہی پوری کر دیتے ہیں۔ آوارہ گرد بیوی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے متعلق اپنے تجربہ کی بنیاد پر کچھ کہنے سے قاصر ہے اگر کوئی شادی شدہ شخص اس ضمن میں آوارہ گرد کی تصحیح یا تصدیق کرے گا تو اس کی مہربانی ورنہ آوارہ گرد اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے گا۔

چلتے چلتے یہ بھی بتا دیا جائے کہ آوارہ گرد کو چائے کی کزن گرم کافی کچھ زیادہ پسند نہیں البتہ وہ کولڈ کافی کا دیوانہ ہے۔ کولڈ کافی پر یاد آیا کہ آوارہ گرد کے ایک صحافی دوست کو جنرل ضیا کے مارشل لا کے دنوں میں پشاور میں کہیں شراب کی بوتل ہاتھ لگ گئی، سو پینے کے لیے وہ پشاور شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں جا بیٹھا اور اُس کے بہ قول کولڈ کافی کے دو مگوں میں شراب کی پنٹ معدہ میں ڈال کر بیرے کو ٹپ دے کر بالم بن کر لوٹ آیا۔

چائے پر لکھتے ہوئے آوارہ گرد کو آج سے پندرہ بیس سال قبل کے وہ میزبان یاد آ رہے ہیں جو صبح کے ناشتے کے ساتھ چائے کی کیتلی لے آئے تھے۔ آوارہ گرد نے چائے پینے کی اپنی زیادہ سے زیادہ گنجائش (تین گھریلو کپ) کے بعد جب منع کیا تو میزبان نے چوتھا کپ بھرتے ہوئے کہا کہ جب تک خالی کپ اُلٹا کر کے نہیں رکھا جائے گا تب تک چائے تو پینی پڑے گی۔

آوارہ گرد کی خواہش ہے کہ اس کے تمام جاننے والے آوارہ گرد کے کارٹونسٹ دوستوں اسد اور خالد اور دانشور دوست تنویر گوندل سے زیادہ چائے پینے اور پندرہ بیس سال قبل کے میزبانوں سے خالی کپ اُلٹا نہ رکھنے تک زبردستی چائے پلانے کی عادت سیکھیں تا کہ آوارہ گرد ہر جگہ اپنے جاننے والوں کے پاس چائے کے کم از کم دو کپ ضرور پی سکے۔

# گولی کا نشانہ بننے والے بچّے کا نوحہ

حال ہی میں کراچی میں ہونے والے ہنگاموں کے دوران کسی اَن دیکھے ہتھیار سے داغی گئی گولی نے ایک ڈھائی برس کے بچّے کو مار ڈالا۔ وہ اپنی ماں کی گود میں ایک ویگن کے ذریعے کہیں جارہا تھا لیکن اُس کا یہ سفر آوارہ گرد کو کربلا کے میدان میں حسینؓ کی گود میں معصوم علی اصغر کے سفر کی طرح لگتا ہے، اُسے بھی پانی دینے کے بجائے حلق میں تیر مار کر جوان آنکھوں سے دنیا کا مشاہدہ کرنے سے زبردستی روک دیا گیا تھا۔

بچّے، جن کے لیے ناظم حکمت نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ ’’آؤ کہ یہ دنیا بچّوں کے حوالے کریں تا کہ جنگ و جدل اور نفرت اس دنیا سے رخصت ہوجائے۔‘‘ بچّے دنیا کے تمام مذاہب، ثقافتوں، ادیبوں اور دانش وروں کے لیے ایک مشکل لیکن پسندیدہ موضوع رہے ہیں۔ ٹیگور کا یہ جملہ کہ ’’ہر نیا بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی تک انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے‘‘، آوارہ گرد کو اس وقت تک سمجھ میں نہیں آیا تھا جب تک اس کے کچھ اقارب کے ہاں بچّے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بچّوں کا ہنسنا، رونا اور ننھے ہاتھوں اور نینوں سے اپنے ارد گرد کی دنیا کو حیرت سے دیکھنے اور محسوس کرنے کے عمل سے زیادہ من بھاتا عمل آوارہ گرد نے اپنی زندگی میں تا حال نہیں دیکھا! لارینزو کی یہ بات کہ ’’بچّے نہ ڈیموکریٹس ہیں نہ فاشی، کمیونسٹ ہیں نہ مذہبی جنونی‘‘ کو آگے بڑھاتے ہوئے آوارہ گرد یہاں تک کہنے کو تیار ہے کہ بچّے نہ سندھی ہیں نہ

مہاجر، شیعہ ہیں نہ سنّی ، بچّے تو بس بچّے ہیں! بچوّں کو کوئی تشبیہ دینے سے تو پابلونرودا بھی قاصر تھا، کہ وہ بھی اپنی ایک نظم میں فقط اتنا ہی کہہ پایا، ’’اور بچوّں کا لہو بچوّں کی طرح رینگتا رہا!‘‘

بچوّں کے ذکر پر آوارہ گرد کو اسپین میں ۱۹۳۰ء کی دہائی کا وہ مُلزم لارینزو بھی یاد آرہا ہے جو خود ڈاکے مارتا تھا، اس کی بیوی بیسوا تھی اور اُس نے اپنے بچوّں کو جیب کاٹنے کی تربیت دی تھی۔ اسپین میں خانہ جنگی شروع ہونے پر لارینزو نے یہ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ، ’’اب لوگ مریں گے اور ہلاک شدہ لوٹ مار کی مزاحمت نہیں کرتے۔‘‘ آج کے اسپین میں انسانیت دوست انسانوں کے پاس لورکا جیسی اہمیت رکھنے والے لارینزو نے جب لورکا کی لاش پر بلڈوزر چلتے دیکھا تو کسی افسوس کا تاثّر دیے بغیر قہقہہ مار کر کہنے لگا کہ ’’اس سے تو بہتر ہوتا کہ وہ (لورکا) بھی میرا ساتھی بنتا اور اس طرح اپنی ہڈّیوں کا سرمہ نہ بنواتا۔‘‘ تاہم جب اسپینی آمر جنرل فرانکو کی فوجوں، نے میڈرڈ کا گھیراؤ کر کے شہر کا پانی بند کر دیا تو لارینزو خاموش نہیں رہ سکا اور اس مرحلے پر اُس نے ایسا جملہ کہا جو ٹیگور برسوں کی تپسیہ کے بعد ہی کہہ پائے تھے۔ لارینزو نے کہا کہ ’’بچّے کیوں تشنہ مریں۔ بچّے نہ ڈیموکریٹس (فرانکو سے نبرد آزما حلقے کا عام فہم نام) ہیں نہ فاشی۔‘‘ وہ مشکیزہ شانے پر رکھ کر پانی بھرنے گیا تو فرانکو کی فوج نے اُسے کمیونسٹوں کا جاسوس سمجھ کر گرفتار کرلیا۔ اُسے پھانسی دی گئی اور اس کی لاش تین دن تک سولی پر لٹکی رہی۔

آوارہ گرد کو لارینزو اور کربلا کے راہی غازی عباسؓ اور وہاں آخری لمحے پر حق وباطل کے درمیان درست فیصلہ کرنے والے حُر میں مماثلت نظر آتی ہے تاہم آوارہ گرد اپنی طبعی زندگی میں کوئی حُر یا لارینزو نہیں دیکھ سکا ہے۔

آوارہ گرد کے سامنے ایک سوال سولی کی طرح ایستادہ ہے کہ کیا ہم اپنے رویوّں میں ’’شمر‘‘ ہوگئے ہیں، جو کسی بچّے کو جیون کا تبسّم بھرا پانی پلانے کے بجائے اس کے حلق میں تیر مار کر مزا لیتے ہیں؟ کیا ہم میں کوئی لارینزو نہیں جو بچوّں کو مستقبل سے لطف اندوز ہونے کا پروانہ لادے؟ کیا ہم میں کوئی غازی عباس نہیں جو فرات کے کنارے سے فقط اس لیے تشنہ لوٹ آئے کہ پیچھے بچّے پیاسے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ شیعہ ذاکرین کی یہ بات اکثر لوگوں کو ناقابلِ فہم لگے کہ فرات کے کنارے سے غازی عباسؓ کا گھوڑا بھی اپنے مالک کو پانی نہ پیتا دیکھ کر پیاسا ہی لوٹ آیا تھا لیکن آوارہ گرد کو یہ تمام باتیں بچوّں کو پیش ہونے والا اخراج تحسین لگتی ہیں۔ بچّے جن کے لیے فلسطینی شاعر توفیق زیاد نے کہا تھا کہ ’’میں اپنی نصف زندگی اس کو دان کردوں گا جو کسی

روتے ہوئے بچے کے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے۔" لیکن آوارہ گرد اپنی پوری زندگی فقط اس بات پر ارپن کرنے کو تیار ہے کہ کوئی روتے ہوئے بچے کے آنسو ہی پونچھے!

آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ بچے ہمارے دوست رحمت مانجوٹھی کے افسانے کے کردار بچوں کی طرح جوہری اسلحہ کے جھولوں میں نہ جھولیں بلکہ وہ اسد اور خالد کے پتلی تماشے اور ٹی وی پر کارٹون شو دیکھ کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو جائیں اور یوسف سیف کی بیٹی کائنات بڑھی ہو کر کائناتوں کے تاحال راز بنے ہوئے راز افشا کرے اور آوارہ گرد کی بھانجی زہرہ بتول جسے آوارہ گرد زُہرہ کہتا ہے، بڑی ہو کر زہرہ سیارے کی طرح چمکے اور آوارہ گرد کے، ذہن میں طے شدہ نام "شنکر حسین" والا بچہ اپنی جوانی میں ہری شنکر جیسا ذہین اور حسین ابن علیؑ کی طرح سچ بولنے والا بنے!

آوارہ گرد اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے کہ کائناتوں، زہراؤں اور شنکر حسینوں کو جینے دو! انہیں زندگی کا لطف لینے دو! زندگی جو ہم اپنے اندر کے گرہن سے آلودہ کر چکے ہیں اور اس زندگی کی آلودگی کو یہ بچے ہی صاف ستھرا کر سکتے ہیں۔

# شادی، ہاتھ ریکھا اور آرٹسٹوں کے اچھوتے خیال

کچھ عرصہ ہوا، اخبارات میں ایک خبر شایع ہوئی کہ ایک شخص کو شادی کے دن دل کا دورہ پڑا اور اُسے اسپتال داخل ہونا پڑا۔ کچھ دنوں بعد اسپتال کے کمرے میں ہی اس شخص کی شادی ہوئی۔ اس سے کچھ دن قبل اخبارات میں یہ خبر بھی شایع ہوئی تھی کہ ایک بھارتی سرمایہ دار کے بیٹے نے اپنی شادی کا اہتمام ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران کیا تھا۔ تخلیق کاروں کی سرزمین ہندوستان کے اِس نوجوان کی شادی کے پھیرے زمین سے کوئی آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوئے۔

شادی کا معاملہ بھی عجب ہے۔ اس سے متعلق یہ کہاوت تو تقریباً پوری دنیا میں مشہور ہے کہ ''شادی بور کا لڈو، جو کھائے پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔'' لیکن آوارہ گرد کا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ شادی نہ کر کے پچھتانا کچھ زیادہ بہتر ہے۔ آوارہ گرد شادی کا خواہ مخواہ نظریاتی مخالف بھی نہیں لیکن شادی شدہ لوگوں کی حالت دیکھنے کے بعد کسی غیر شادی شدہ شخص کو یہ رائے قائم کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

شادی کے ذکر پر آوارہ گرد کو شادی کی کئی ایک دلچسپ رسومات اور وارداتیں یاد آ رہی ہیں۔ بچپن میں آوارہ گرد کو شادی کی رسومات سے اس لیے بھی دلچسپی تھی کہ دولہا اور دلہن کے ہاتھوں توڑا جانے والا ناریل اور تل کھانے کو ملتے تھے۔ اس کے علاوہ آوارہ گرد کو سر ٹکرانے کی

رسم (سندھ کی ایک مقامی رسم) ابھی تک اچھی لگتی ہے۔

شادی کی رسومات ہر برادری اور ہر زبان بولنے والوں میں مختلف ہیں۔ آوارہ گرد نے راجستان کے راجپوتوں کی ایک شادی میں باراتیوں اور دلہن والوں کو ایک دوسرے پر لاٹھیاں اٹھاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ بارات میں ہڑبونگ مچ گئی۔ آوارہ گرد کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ورنہ وہ تو دوسروں کے جھگڑوں میں خواہ مخواہ کود پڑنے کا شوقین ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب معاملہ ٹلا تو آوارہ گرد کو اس کے ایک راجستھانی دوست نے بتایا کہ اس رسم/جھگڑے کا مقصد یہ ہے کہ دلہن والے باراتیوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ اُن میں اگر ہمت ہے تو دلہن لے جائیں! اس دوست کے مطابق پرانے زمانے میں باراتیوں کے کم زور ہونے پر بارات کو واپس بھی کیا جاتا تھا۔

پاکستانی فلموں کے گھسے پٹے ڈائیلاگ ''یہ شادی نہیں ہوسکتی!'' کا عملی مظاہرہ آوارہ گرد کے ایک دوست نے اُس وقت دیکھا جب ایک بارات مقرّرہ وقت پر کراچی کے ایک شادی ہال میں نہیں پہنچی تو دلہن کے باپ نے غصّے میں آ کر اپنے بھانجے سے اپنی بیٹی کا بیاہ کر دیا۔

اپنی پسند کے مرد یا عورت سے شادی کرنے کے لیے کئی لوگوں نے انتہائی عجیب و غریب کام بھی کیے ہیں۔ برطانوی بادشاہ جارج ہشتم نے بادشاہت چھوڑی اور کرشن چندر سلمیٰ صدیقی سے بیاہ کرنے کے لیے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے اور عبدالقدوس ٹائپ نام اختیار کیا۔ آوارہ گرد کو شادی کی دلچسپ تقریب ہندی کے مشہور افسانہ نگار اور انگریزوں کے خلاف بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کے ساتھ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کرنے والے پدم بھوشن ''یشپال'' کی نظر آتی ہے۔ اس یار نے اپنے خلاف مقدمہ چلانے والے انگریز مجسٹریٹ کو ایک درخواست پیش کی کہ اُس کی منگیتر کو جیل آ کر اُس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی جائے۔ جب انگریز جج نے اس'' خطرناک مجرم'' کو اس قسم کی اجازت دینے سے انکار کیا تو ہندوستان کی اس خاص عدالت سے لے کر لندن میں برطانوی پارلیمنٹ تک ایک قانونی بحث شروع ہوگئی کیوں کہ اُس وقت تک برطانوی قانون میں جیل کے اندر شادی نہ کرنے سے متعلق کوئی ضابطہ نہیں تھا۔ بالآخر یشپال کو جیل میں شادی کرنے کی اجازت ملی اور پہرے داروں کی نگرانی میں اس کا بیاہ ہوا۔

آرٹسٹوں کے پاس ہر معاملے میں اچھوتے خیال ہی ہوتے ہیں۔ اچھوتی بات تو عینی

کے ناول ''سیتاھرن'' میں بھی ہے جب ناول کے ایک اہم کردار ''جمیل'' نے ناول کی ہیروئن ''سیتا میر چندانی'' کو لندن کے ایک زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر اُس وقت شادی کرنے کی پیشکش کی جب میٹرو ریل کے دروازے بند ہونے میں کچھ لمحے باقی تھے۔

غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے آوارہ گرد یہ بات سمجھ نہیں سکا ہے کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو اکثر لوگوں سے شادی کے لیے ان سے ان کا بہت کچھ دستبردار کرا دیتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت نے اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود ایک مسلمان سے عشق کیا اور نہرو کی بیٹی اندرا نے ایک پارسی فیروز گاندھی سے بیاہ کیا۔ ایرانی نسل کی نصرت اصفہانی نے ایک پس ماندہ علاقے کے شادی شدہ نوجوان ''زلفی'' سے اپنے گھر والوں کی انتہائی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی شادی کی اور پوری زندگی اُسے پوجتی رہی!

شادی کے ذکر پر یاد آیا کہ مشہور پامسٹ کیرو اپنی جوانی کے ایام میں ایک ایسی تنظیم کا رکن تھا جن کے اراکین نے حلف اٹھایا تھا کہ وہ پوری زندگی شادی نہیں کریں گے۔ ایک دن ایک چودہ سالہ لڑکی کیرو کو اپنا ہاتھ دکھانے آئی۔ کیرو نے اُس کی ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر بتایا کہ اُس کی دو شادیاں ہوں گی۔ پہلی شادی تو جلد ہوجائے گی تاہم دوسری شادی کے لیے اُسے طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر وہ لڑکی ''میں تمہارے لیے دس سال بھی انتظار کرسکتی ہوں'' کہہ کر کیرو کے دفتر سے چلی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اُس لڑکی کا ایک فوجی کپتان سے بیاہ ہوا۔ شادی کے ایک سال کے بعد جنگ شروع ہوئی اور یہ کپتان جنگ کے دوران لاپتہ ہوگیا۔ اُن دنوں کے قانون کے مطابق اس خاتون کو اب دوسری شادی کے لیے سات سال انتظار کرنا تھا۔ لڑکی کی ہاتھ ریکھائیں دیکھنے کے تقریباً آٹھ نو سال بعد کیرو سخت بیمار ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے صحت مند ہونے سے مایوسی ظاہر کی تو اس کے کچھ دوستوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس بھری دنیا میں کیرو کا کوئی نہیں، اخبار میں اشتہار شایع کرایا کہ مشہور پامسٹ کیرو قریب المرگ ہے اور اگر اس کا کوئی رشتہ دار ہو تو فلاں اسپتال میں آ کر اُس سے مل جائے۔ اس لڑکی نے بھی یہ اشتہار پڑھا اور اسپتال پہنچ گئی۔ اس کی تیمارداری یا عشق نے کیرو کو ٹھیک کر دیا۔ طبیعت کی بحالی کے بعد کیرو نے دو کام کیے، ایک تو ہمیشہ غیر شادی شدہ رہنے والوں کی تنظیم سے استعفیٰ دیا اور دوسرا اُس لڑکی کے لیے منگنی کی انگوٹھی بنوائی۔

انتہائی جانفشانی اور مشکلات کے بعد شادی کے بہت زیادہ قصے آوارہ گرد نے امرتا پریتم کی کتاب ''ایک ہاتھ مہندی ایک ہاتھ آبلہ'' میں پڑھے ہیں۔ آوارہ گرد پہلے ہی لکھ چکا ہے کہ وہ شادی کا کوئی نظریاتی مخالف نہیں البتہ شادی ایسی کی جائے کہ بہت کچھ گنوا کر زور دار جیون ساتھی پایا جائے ورنہ دنیا میں روزانہ لاکھوں شادیاں ہوتی ہیں اور ابتدائی دس پندرہ دنوں کے بعد میاں بیوی میں چپقلش شروع ہوتی ہے تو نسلوں تک باقی رہتی ہے!

# میزان۔ ناسٹلجیا اور آنسوؤں کے موتی

کراچی پریس کلب کے آرٹسٹ ویٹر میزان الرحمان نے اُس دن ڈھاکہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈھاکہ میں غربت ہے، مسائل ہیں لیکن ڈھاکہ ڈھاکہ ہے، اور پھر وہ کوئی آدھے گھنٹے تک ڈھاکہ کی ناسٹلجیا میں غرق رہا۔ ڈھاکہ کا ذکر وہ فقط اس لیے کر رہا تھا کہ ڈھاکہ اُس کا شہر ہے اور ہر ایک کی طرح وہ بھی اپنے شہر کو بھول نہیں سکا ہے۔

آوارہ گرد بھی اپنے شہر حیدر آباد کو بھولنے میں بالکل ناکام رہا ہے اور اس ناکامی کا اعتراف آوارہ گرد میں فخر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اپنے شہر یا دیس کو تمام تر خرابیوں کے باوجود اپنا کہنا آوارہ گرد کی رائے میں شاید کھانے پینے اور سونے کی طرح انسان کی جبلّت میں شامل ہے۔ شیکسپیئر سے لے کر کراچی کے لالوکھیت میں چھولے بیچنے والے تک، ہر ایک اپنے علاقے کی اس طرح تعریف کرتا ہے جیسے باقی تمام دنیا، اس جدید شہر میں رہنے والے کے سامنے چچوں کی ملیاں ہو!

برصغیر کی تقسیم کے بعد تو اپنے شہر یا علاقے کو یاد کرنے کا رجحان سیاسی نفرت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ تقسیم برصغیر کی ہو یا سندھ کی یا پھر حیدر آباد شہر کے حدود کی، اس کا عذاب صدیوں تک ہر ایک کو جھیلنا پڑتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے نتیجے میں چائے کے کپ پر دہشت گرد منصوبے بنانے والے بنگالیوں سے لے کر بھنگ اور تصوف کی پینک میں مدہوش سندھیوں تک

برصغیر کا ہر فرد اب تک حیران و پریشان ہے۔

ہاں، تو بات ہو رہی تھی اپنے شہر کو یاد کرنے کی۔ آوارہ گرد اب تک یہ بات سمجھ نہیں سکا ہے کہ اگر لالو کھیت میں رہنے والا کوئی شخص دہلی یا رائے بریلی کو یاد کرے تو ''گنہگار'' لیکن سندھ سے نقل مکانی کرنے والے کمیونسٹ مصنف اُتم اور گوبند مالھی سندھ کو یاد کریں تو دھرتی کے سپوت!

اپنے شہر کی یاد میں تڑپتے ہوئے آوارہ گرد نے ڈاکٹر جی ایم مہکری کو بھی دیکھا ہے، جو اکثر اپنے شہر بنگلور کا ذکر کرتے ہوئے انتہائی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ مہکری صاحب تو آدمی ہی لاجواب ہیں، سو باتیں بھی لاجواب کرتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے شہر کو یاد کرتے ہوئے غلام مجتبیٰ بنگلوری کے نام سے لکھتے اور شایع کراتے ہیں۔

ڈاکٹر مہکری برصغیر کی تقسیم کے دوران نقل مکانی کرنے والوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے بہ قول ایک گروہ مال کمانے آیا، دوسرا مار کھا کر آیا جب کہ تیسرا بغیر کسی مقصد کے یا تفریحاً آیا۔ تفریحاً اپنے شہر چھوڑ آنے والے ہی سب سے زیادہ عذاب جھیلتے ہیں۔

آوارہ گرد کو حال ہی میں ایک غیر ملکی ریڈیو اسٹیشن سے خبریں پڑھنے والے ایسے پاکستانی ملے جو پچھلے بیس پچیس برسوں سے مغرب میں رہتے ہیں لیکن اُن دنوں وہ کراچی میں گھر لینے کے لیے بے چین تھے۔ آوارہ گرد نے جب انہیں کراچی کے حالات سے ڈرانے کی کوشش کی تو انہوں نے ایک جملے میں ہی آوارہ گرد کو لاجواب کر دیا کہ ''یار! وہ شہر جس میں بچپن اور جوانی کے دن گزرے، وہ چاہے سینے میں چھرا ہی مار دے لیکن لگتا پھر بھی پیارا ہے!''

آوارہ گرد نے ۱۹۸۹ء میں انٹرنیشنل سچل کانگریس کے موقعہ پر بھارت سے تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ کراچی آنے والے ترقی پسند مصنف گوبند مالھی کو سابقہ کوئنس روڈ اور حالیہ مولوی تمیز الدین روڈ پر انتہائی جذباتی ہوتے دیکھا، جہاں انہوں نے اپنی جوانی کے دن گزارے تھے۔

بھارت یاترا کرنے والے آوارہ گرد کے تمام جاننے اور وہاں کے سندھی میں سفرنامے لکھنے والے تمام مصنفین فقط ایک بات پر متفق ہیں کہ تقسیم کی وجہ سے بھارت نقل مکانی کرنے والے سندھیوں کو سندھ اب تک یاد ہے جب کہ سندھ میں رہنے والے سندھی دانش ور اپنے دیس/ شہر کے لیے ویسا ہی جذبہ رکھنے والے اردو بولنے والوں کے اس جذبے کو سندھ دشمنی

سے تعبیر کرتے ہیں۔ آوارہ گرد کی بس اتنی سی خواہش ہے کہ اگر سندری اُتم چندانی کو آرامی یا آرام باغ کراچی میں اپنا آبائی گھر یاد کرنے کا حق دیا جائے تو پھر زاہدہ حنا سے اپنے آبائی شہر کو یاد کرنے کا حق چھیننے کی کوشش نہ کی جائے۔

اپنے شہر اور دیس کو اپنائیت سے یاد کرنے کے ذکر پر آوارہ گرد کو قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' بہت زیادہ یاد آرہا ہے، جس میں ہندوستان سے لندن تعلیم کے لیے گئے ہوئے نوجوان ہندوستانیوں کا ایک گروہ اپنے شہر کے قبرستان، پرانے گھروں اور چاند کے طلوع ہونے کو یاد کر کے اس طرح جذباتی ہوجاتے ہیں جیسے کی مجلس میں مصائب سنتے ہوئے شیعہ ہوتے ہیں۔ اسی ناول میں یہ نوجوان وطن کے ذکر پر اس طرح سنجیدہ ہوجاتے ہیں جیسے بھارتی فلم ''نام'' میں شامل غزل ''بڑے دنوں کے بعد، ہم بے وطنوں کو یاد، وطن کی مٹی آئی ہے'' کا نثری اظہار کرتے ہوں۔

آوارہ گرد کی بس ایک ہی خواہش ہے کہ ہر کوئی اپنے شہر کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح ''اون'' کرے جیسے شیکسپیئر نے کہا تھا کہ ''او انگلینڈ! میں تمہارے غداروں سے بھی پیار کرتا ہوں۔'' لیکن اپنے شہر کے لیے فخر کو کسی دوسرے کے شہر کے لیے تذلیل یا دھتکار کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ آگرہ کا باسی اس بات پر تو فخر کرے کہ اُس کے شہر میں تاج محل جیسا عشق کا لافانی اظہار ہے لیکن شیخ ایاز کی طرح کسی پر یہ فتویٰ صادر نہ کرے کہ'' تم ملیر کو چھوڑ کر، کچھ بھی بن جاؤ، ماروئی نہیں رہو گی۔'' ہاں، جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزل کو ضرور گنگنایا جائے کہ'' ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند!'' اور پھر دیس سے دوری کی صورت میں اُسے یاد کر کے آنسو پی لیے جائیں، آنسو جن کی قیمت دنیا کے تمام موتی بھی چکا نہیں سکتے!

# ستار ایدھی — گاؤں سے پہلی مرتبہ شہر آنے والا بچّہ

اخبارات میں ایک تصویر شایع ہوئی ہے جس میں بین الاقوامی شہرت یافتہ سماجی کارکن عبدالستار ایدھی اپنے ادارے کے اخراجات کے لیے امدادی ٹوکن فروخت کر رہے ہیں اور اس دوران صدر فاروق لغاری کی موٹر گاڑیوں کا کارواں گزر رہا ہے۔ ایدھی اس کارواں کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے ہیں لیکن شیشے چڑھی ایئر کنڈیشن گاڑیوں میں سوار، ایدھی سے پانچ روپوں کا امدادی ٹوکن لینا تو درکنار اُسے ہاتھ ہلا کر سلام کا جواب بھی نہیں دیتے! تصویر کے کیپشن کے مطابق بس سندھ کے وزیر اعلیٰ سید عبداللہ شاہ نے ہاتھ ہلا کر ایدھی کو سلام کا جواب دیا۔

آوارہ گرد اپنی زندگی کے کئی سال ایدھی ٹرسٹ کی سرگرمیوں میں ایک رضا کار کے طور کام کر کے گزار چکا ہے۔ آوارہ گرد کو اس بات پر فخر ہے کہ اُس نے کراچی سے ٹھٹھہ اور وہاں سے واپس کراچی تک کا سفر ایدھی کے ساتھ ایک جیپ میں کیا ہے۔ اس سفر کے دوران مستقل طور پر دنیا کی اہم شخصیات میں سے ایک، عبدالستار ایدھی، آوارہ گرد کو کسی دور دراز گاؤں سے پہلی مرتبہ شہر آنے والا بچّہ لگا جو ہر پیدل چلنے والے اور گاڑی میں سفر کرنے والے کو ہاتھ ہلا کر سلام کر رہا تھا۔ اس دوران کچھ غریب اور مسکین لوگوں نے ایدھی سے پانچ روپے والے ٹوکن بھی خریدے تھے۔ عام لوگوں سے ایدھی کو ملنے والی تکریم آوارہ گرد لاہور میں بھی دیکھ چکا ہے، وہاں بھی امدادی ٹوکن فروخت ہو رہے تھے۔

ایدھی، جسے ذرائع ابلاغ کے عالمی ادارے متفقہ طور پر یتیموں اور بے گھروں کا سائبان اور کراچی کا مسیحا کہتے رہے ہیں، ہمیشہ بے بس اور مظلوم کا ساتھی رہا ہے جب کہ صاحبِ اقتدار افراد کے ہاتھوں نظر انداز کیا گیا اور تشدّد کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ پھر چاہے وہ ایم کیو ایم ہو جس کے زخمی اور ہلاک شدہ ووٹروں کو ایدھی ایمبولینس ہی اسپتال پہنچاتی رہیں، لیکن جب ایم کیو ایم کراچی سمیت سندھ کے شہری علاقوں کے راج سنگھاسن پر بیٹھی تو ایدھی سینٹروں پر حملے کیے گئے اور سب سے زیادہ شرمناک صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب ایدھی سینٹر میر پور خاص کے بوڑھے انچارج کو برہنہ کر کے تشدّد کا نشانہ بنایا گیا۔

پیپلز پارٹی کو بھی نواز شریف دور میں راولپنڈی میں ہونے والے لانگ مارچ کے دوران ایدھی ٹرسٹ کی ایمبولنسوں کے سائرن بھولنے نہیں چاہئیں! سابق صدر فاروق لغاری کی یاد داشت اتنی کم زور تو نہیں ہونی چاہیے کہ وہ یہ بھی بھول جائیں کہ ان کی ہی پارٹی کے رہنماؤں ڈاکٹر اسماعیل اڈیجو اور جگدیش ملانی اور صحافی فقیر محمد لاشاری کی لاشیں اور غلام قادر پلیجو کا زخموں سے گھایل جسم ایدھی ایمبولینس نے ہی اسپتال پہنچائے تھے۔

آوارہ گردی رائے میں بات یہ نہیں کہ ایدھی کی خدمات کے عوض اُسے میڈل دیے جائیں لیکن اصل مسئلہ فاروق لغاری سے لے کر شبیر شر تک اور الطاف حسین سے اعجاز جتوئی تک، ہم سب کے رویّوں کا ہے۔ حاکموں نے تو ہر نہ جھکنے والے اور جفاکش کو تازیانے دیے ہیں لیکن ہمارے ''باشعور اور باوثوق'' بھی ایدھی کو تنگ کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ضیا مارشل لا کی مجلسِ شوریٰ سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہونے والے عبدالستار ایدھی سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ قتل ہونے والی لیڈی ڈاکٹر کی لاش کسی ایم پی اے سے ڈر کر خاموشی سے دفن کر دے گا۔

جنرل ضیا سے ملنے والے چیک واپس کرنے کا حوصلہ رکھنے والے ایدھی کی سرگرمیاں صدر فاروق لغاری کے فقط پانچ روپوں کے عوض تو بند نہیں ہوسکتیں۔ آوارہ گردی رائے ہے کہ ہم سب اپنے رویّوں میں انتہائی مادّیت پرست ہوگئے ہیں اور ہماری اخباری دنیا کے کارکنوں کے لیے وہی شخص ''اہم'' ہے جو ان کے سر پر ڈنڈا برسائے یا پھر انہیں لفافوں کی چمک دکھائے۔ اخبارات سے وابستہ ہم تمام لوگ ہر بات میں ''خبر'' ڈھونڈتے ہیں، یہاں تک کہ ایدھی کی ایمبولنس میں ہتھیار ہونے کی دعویٰ کرنے والی پریس ریلیز پر بغیر تصدیق کیے ہوئے اداریہ بھی

لکھ دیتے ہیں! پھر ایسی صورت حال میں عبدالستار ایدھی ملک چھوڑنے کی بات نہ کرے تو پھر کیا کرے۔

آوارہ گرد کا خیال ہے کہ مسئلہ فقط ایدھی کا نہیں، ہم تمام سماجی سدھارک لوگوں کو کسی اہمیت کا حامل نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اندھی آنکھوں کو جوتی دینے والے ڈاکٹر صالح میمن سے ملاقات کے لیے سندھ کے وزیر اعلیٰ سید عبداللہ شاہ کے پاس وقت ضرور ہوتا! اور محترمہ بےنظیر بھٹو محض ارشاد احمد حقانی کے کالم پر سندھ کے بے لوث سماجی کارکن حافظ صدیق میمن کی شب و روز کی محنت کی حاصل مخدوم بلاول ہاؤسنگ سوسائٹی کا پلاٹ رد کرنے کے لیے سندھ کے ارباب اختیار کو ہدایات جاری نہ کرتیں!

یہ المیہ صرف ہمارے بدنصیب ملک تک محدود نہیں بلکہ کبھی مدر ٹریسا پر ''جنسی بے راہ روی'' کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں تو کبھی صومالیہ کے جنگی میدانوں میں انسانی بنیادوں پر بیماروں اور بھوکوں کی دیکھ بھال کرنے والے کارکنوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ آنے والے وقت میں کسی ایدھی کو ملک چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ کسی مسکین جھان خان کھوسو کو ڈی پی آر میں گرفتار نہ کیا جائے، بلکہ ہم میں سے ہر کوئی ڈاکٹر ادیب رضوی اور عبدالستار ایدھی کی طرح انسانوں اور اُس بے نام پارسی خاتون کی طرح جو زخمی اور بیمار جانوروں کا اپنے خرچہ پر علاج اور بھوکے اور بے گھر جانوروں کو اپنے خرچہ پر دانہ پانی مہیا کرتی ہے، جانوروں/ پرندوں کے دکھ درد مٹانے کے لیے تگ و دو کرے، کیوں کہ دنیا اور لوگ کسی ٹاٹا، باٹا، دادا بھائی کے بجائے فلورنس نائیٹ انگیل اور مارٹن لوتھر کنگ کو یاد رکھتے ہیں کہ دنیا ایسے ہی کچھ باوصف لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے قائم ہے۔ ورنہ ہم نے تو اسے جہنم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی!

# بے گھر شہزادے اور گھر کا گم شدہ پتہ

اخبارات میں شایع ہونے والی ایک خبر کے مطابق یورپ میں بے گھر افراد کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے اور کچھ یورپی ممالک میں تو یہ تعداد ایک ہزار کی آبادی پر آٹھ کے تناسب تک جا پہنچی ہے۔ بے گھر ہونا نہ کوئی نئی بات ہے اور نہ یہ معاملہ یورپ تک محدود ہے۔ آوارہ گرد ہر اس شخص کو ''بے گھر'' سمجھتا ہے جو خاندان کے کسی ضابطہ کے بغیر زندگی گزارتا ہو۔ آوارہ گرد نے گھر کی تشریح محمود درویش کی ایک نظم کے مصرعے سے بہتر کہیں نہ پڑھی ہے نہ سنی ہے۔ فلسطین کے انقلابی شاعر محمود درویش اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں ''گھر تو ماں کے شفیق ہاتھوں سے بنی ہوئی گرم کافی پینے کا نام ہے۔'' پھر ماں کے شفیق ہاتھوں سے بنی ہوئی کوئی چیز کھانے یا پینے سے محروم شخص چاہے کسی فٹ پاتھ پر رہے، کسی مسافر خانہ کی کرایہ پر لی گئی چار پائی پر سوئے یا کسی بین الاقوامی ادارے کے ہاسٹل میں رہے — آوارہ گرد کی رائے میں بس Status کا فرق ہے ورنہ بھاولپور سے آنے والے فقیر اور قبائلی علاقے سے آنے والے پٹھان مزدوروں میں اور آوارہ گرد، حسن مجتبیٰ یا نقاش میں کوئی خاص فرق نہیں۔ یہ تمام بے گھر اپنی اپنی ڈپریسنگ تنہائی میں اپنے اپنے انداز میں'' تو نے دیکھا نہیں نقشہ میری تنہائی کا'' اور '' رو کر شبنم پھول کو گلے لگاتی ہے یا کہ پوچھتے پر میرے پہلو میں کوئی نہیں'' جیسی کیفیتوں سے گزرتے ہیں۔

آوارہ گرد بے گھروں کو مختلف درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک تو بھیک منگے جن کے پاس مستقل گھر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسرے، وہ مزدور جو اتنا کم کماتے ہیں کہ گھر جیسی عیاشی اُن کے نصیب میں نہیں۔ تیسرے، اپنے انداز اور رویے کی وجہ سے بوھمین انداز اختیار کر کے گھروں کے قید خانے سے بھاگ جانے والے۔

پاکستان کے نوجوانوں میں بے گھر بننے کا جنون (Craze) ۸۰ء کی دھائی میں بے مثل تھا، جب پڑھے لکھے نوجوان ''انقلاب'' کے نام پر اپنا گھر بار چھوڑ کر'' کا رِجحان دراز'' میں بھٹکتے رہتے تھے۔ آوارہ گرد خود کو بھی اسی نسل کا ایک ایسا فرد سمجھتا ہے جو اپنے گھر کا راستہ بھول گئی ہے اور المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی اُسے ایدھی والوں کے حوالے نہیں کرتا کہ ریڈیو پروگرام'' یہ بچہ کس کا ہے'' میں انٹرویو دے کر کسی چار دیواری تک پہنچ کر برسوں کے رت جگوں کے بعد طویل نیند سونے کی ریہرسل ہی کرے!

بے گھری کے ذکر پر آوارہ گرد کو حیدر آباد کا وہ نوجوان پُرجوش سیاسی کارکن یاد آ رہا ہے جو جنرل ضیا کے مارشل لا کے ابتدائی برسوں میں اگر جیل میں نہیں ہوتا تھا تو پھر رات کو ایک ٹریڈ یونین کے دفتر میں سوتا اور دن میں اپنی پوری قوت اور ایمان داری کے ساتھ دنیا کو تبدیل کرنے کی جدو جہد میں شامل ہونے کے لیے لوگوں کو متفق کرنے میں گھنٹوں مصروف رہتا تھا۔ یہ نوجوان آج کل کسی یوروپی ملک میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کمانے میں مصروف ہے۔

ستر کی دہائی کے آخری اور اسّی کی دہائی کے ابتدائی نصف کے ان بے گھر نوجوانوں کے لیے آنے والا وقت شاعر کا مصرعہ ''چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا'' ثابت ہوا۔ کسی کنواری لڑکی کے سنبھالے ہوئے کنوار پن کی طرح ذہن میں پروان چڑھائے ہوئے آدرش دیوارِ برلن کی اڑتی ہوئی دھول کی طرح پرزا پرزا ہو کر مٹی ہوئے تو زندگی میں بڑے سے بڑا صدمہ برداشت کر جانے والے آوارہ گرد سمیت کئی نوجوان بالکل ایسے بکھر گئے جیسے کسی ہندو کی لاش کی راکھ کو شمال کی ہوا اڑا لے جائے۔

بے گھری کی یہ روایت ستر اور اسّی کی دہائیوں میں ہی شروع نہیں ہوئی ہے۔ آوارہ گرد کا واحد آئیڈیل سندھی دانش ور حشو کیولر امانی بھی اس قبیلے کا فرد تھا۔ تقسیم کے بعد یہ بے گھر شہزادہ بمبئی کے کسی مسان میں رہتا تھا جہاں کا پنڈت اس پر اس لیے بھی ناراض تھا کہ وہ رات گئے تک اپنے ٹائپ رائٹر پر ٹک ٹک کر کے کچھ لکھتا رہتا تھا۔ پنڈت نے غصّے کے مارے

ایک دن کسی ارتھی کی نیم جلی لکڑی اس کے سر پر دے ماری تھی۔ بالآخر غریب الوطن اور بے گھر حشو کیولر امانی کو ایک دن گنگا میں گھر مل گیا!

آوارہ گرد کا مشاہدہ یہ ہے کہ کئی لوگ گھروں کی چاردیواری میں رہنے کے باوجود بے گھر ہوتے ہیں۔ آوارہ گرد کی رائے ہے کہ جپسی ہونا ''نسلی'' نہیں بلکہ ''ذہنی'' معاملہ ہے کہ کہیں تو دنیا یا سماج کا ضابطہ کسی بھی صورت میں قبول نہ کرنے والا نسلی جپسی کسی ملک کا سربراہ ہوکر بسیرا کرتا ہے تو کہیں اپنے محدود دائرے سے باہر نہ نکلنے والے خاندان کا کوئی فرد بیگ کندھے پر لٹکائے آوارہ بادلوں کی طرح بھٹکتا رہتا ہے۔

بے گھر لوگوں یا نوجوانوں کے لیے آوارہ گرد کی کوئی خاص خواہش نہیں کیوں کہ آوارہ گرد کی رائے ہے کہ خواہشات ان ہونی چیزوں سے متعلق کی جاتی ہیں جب کہ بے گھر دنیا کی وہ بھٹکتی اور اداس نسل ہیں جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔

آوارہ گرد فقط اتنا چاہتا ہے کہ تمام بے گھر لوگوں کے ٹھکانے ہوٹل، پارک، چائے خانے اور ہاسٹل ہمیشہ پُرسکون رہیں اور کوئی بھی بے گھر رام کی طرح بن باس کاٹ کر اپنے گھر لوٹنا چاہے تو کسی گم شدہ بچے کی طرح اُسے بھی ریڈیو پروگرام ''یہ بچہ کس کا ہے'' میں اپنوں کو پکارنے کا موقعہ ملے یا پھر کوئی وقت بے وقت بے گھروں کو اخبارات میں ''تم جہاں بھی ہو لوٹ آؤ، تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا'' جیسے اشتہار شایع کرا کر یاد کرتا رہے۔ اس سے زیادہ کوئی بے گھر کیا فرمائش کرسکتا ہے!

☆......☆......☆

# پروین شاکر۔ ’’بڑا ہے درد کا رشتہ‘‘

چھوٹے قد اور بڑی شاعری کرنے والی شاعرہ پروین شاکر سڑک کے حادثہ میں ہلاک ہوگئی۔ پروین شاکر دو ’’جرائم‘‘ کی مرتکب ہوئی تھی، ایک تو پیغمبری پیشہ (شاعری) سے ٹین ایجرس والا عشق کرتی تھی تو دوسرا یہ کہ وہ ’’عورت‘‘ تھی۔ یہ سماج جو اپنی منافقتوں کے آخری پائیدان پر ہے، عورتوں کو ’’سات قرآن‘‘ کہہ کر کلہاڑیوں، پتھروں یا گولیوں کا ذائقہ چکھاتا ہے یا قرآن سے ان کا بیاہ کرا دیتا ہے، وہ سماج جہاں نام ور ترقی پسند بھی اپنے ’’روایتی‘‘ ہونے پر فخر کرتے ہوں، وہاں آوارہ گرد کے خیال میں پروین شاکر اور اُس کا قبیلہ شاعری کے ذریعے ’’گر آپ ہیں شہر کے قاضی تو گزارش سن لیں ’’یا‘‘ میں ہوں حساس میری عمر گھٹا دی جائے‘‘ جیسی تمنائیں نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ حساس طبیعت اور باغی تحریروں کے مالک لوگوں کو جینے نہ دینا صرف آوارہ گرد کے تارا مسیح دور کے سماج تک محدود نہیں بلکہ سرسوتی دیوی کے دیس بھارت سے ماچو پیچو پہاڑوں میں گھرے لاطینی امریکہ سے لے کر یورپ اور امریکہ تک یہ رویہّ ہر جگہ ہر کسی کے ساتھ ہے۔

حساس طبیعت کے لوگ شاید اپنے کرب کی صلیب کسی اَن دیکھی ہستی سے زبردستی لے کر آتے ہیں، کہ سینے میں شیھ اترنے یا PIMS میں آخری سانس لینے تک بات قرۃ العین حیدر کی ہی رہتی ہے کہ ’’ہمیں صلیب پر چڑھاؤ، یسوعہ کے بجائے ہمیں صلیب پر چڑھاؤ، ہم اس

کائنات کے سب سے بڑے چور ہیں، ہم نے خدا کے خزانے سے لمحے بھر کی خوشی چُرانے کی کوشش کی ہے۔''

عینی کی بات پر یاد آیا کہ خود انہیں بھی تو اپنے ''ہونے'' کی وجہ سے پروین شاکر کے دیس سے دیس نکالا دیا گیا اور امریکہ اور برطانیہ جیسے روشن خیال اور ترقی یافتہ ممالک میں ورجینا وولف اور سلویا پاتھ کے لیے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ ان کے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا اور وہ ۲۰ء کی دہائی میں رقص کی ملکہ کہلانے والی ایسا ڈوراڈ عکن بھی اپنا تمام تر مادی ماحول تیاگ کر لینن کے دیس پہنچی تو نہ صرف اسٹالین کی شخصی آمریت بلکہ شاعر شوہر ایسے نن کے جبر نے اُسے ایک مرتبہ پھر جلا وطن بنایا اور وہ بھی ایک دن کار چلاتے ہوئے گلے میں لپٹا ہوا مفلر پہیے میں پھنسا کر دم گھٹنے کی وجہ سے وہاں چلی گئی جہاں جاتا تو ہر کوئی ہے پر لوٹتا کوئی نہیں!

آوارہ گرد کی رائے میں دنیا کے مرد کسی عورت کو دُکھی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ پھر اگر کوئی عورت ان کے سامنے اپنے وجود کے ثبات کے ساتھ کھڑی ہوجائے تو اُسے کسی نہ کسی طرح راہ سے ہٹانے کے لیے مردوں کے درمیان غیر تحریری معاہدہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ پھر کبھی عورت کو دھکیل کر ریلوے پٹڑی پر کھڑا کیا جاتا ہے کہ سارہ شگفتہ بنے یا ارجنٹائن کی لیلیئم جیمیز کو سچ لکھنے پر جلا وطن کیا جاتا ہے۔

بات ہو رہی تھی پروین شاکر کی اور ہم جا پہنچے ارجنٹائن کی لیلیئم جیمیز کی جلا وطنی تک۔ کریں بھی کیا؟ جیمیز، فہمیدہ ریاض اور تسلیمہ نسرین تو اس حوالے سے کسی حد تک خوش قسمت تھیں کہ کسی حد تک پُرسکون ماحول میں کچھ جلا وطن ایام گزار دیتی ہیں۔ ویسے ہے تو جلا وطنی بھی ایک بڑا عذاب، بہ قول فیض صاحب:

''مرے دل، مرے مسافر<br>
ہوا پھر سے حکم صادر<br>
کہ وطن بدر ہوں ہم تم''

لیکن آوارہ گرد کی رائے میں عذاب تو یہ ہے کہ کوئی اپنی جنم بھومی پر ہی جلا وطنی کا عذاب سہے۔ جنرل ضیا کے جبر کے خلاف آواز بلند نہ کرنے اور اُن دنوں سرکاری ملازمت کرنے والی پروین شاکر تو معتوب ہے لیکن ان دنوں میں جنرل ضیا کے ہاتھ چومنے والوں کے

ہاتھ چومنے والے سرخ رو رہیں۔ اب پروین شاکر پر ایسے الزامات عائد کرنے والوں کو کون بتائے کہ ابھی تک ترقی پسند سمجھے جانے والے مرحوم اختر حسین رائے پوری اپنے گھر والوں اور دوستوں کی مخالفت کے باوجود جنرل ضیا سے ''تمغۂ حسن کارکردگی'' وصول کرنے کے بعد بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی میں شریک تھے لیکن دماغ کے سرطان کی مریض بمبئی کی ٹین ایجر شاعرہ گیتا نجلی کی شاعری اردو میں ترجمہ کرنے کے دوران کرب برداشت کرنے پر پروین شاکر کو کسی نے ''مسکراہٹ کا میڈل'' بھی نہیں دیا!

آوارہ گرد یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد الماس سندھو اور سارہ شگفتہ کی طرح پروین شاکر کو بھی ہر کوئی بھول جائے گا۔ وہ یاد بس اُس فیصل چوک کو رہیں گی جہاں ویگن نے انہیں ٹکر ماری تھی اور وہ ہمیشہ خود کو پروین شاکر جیسی خوب صورت خاتون کا قاتل سمجھتا رہے گا۔ وہ یاد تو اُس نوجوان کو بھی رہیں گی جو ان کا بیٹا ہے اور جسے دنیا کی تمام ماؤں کی طرح اپنے پیروں پر کھڑا دیکھنے کی خواہش اُس کے پاس دنیا فتح کرنے سے بھی زیادہ اہم ہوگی اور یقینی طور پر وہ اُس خالی جیب آوارہ گرد نوجوان کو بھی یاد رہے گی جو اُس کی کتابیں دکانوں کے بند شوکیس سے تو کیا پرانی کتابیں فروخت کرنے والوں سے بھی نہیں لے پایا!

آوارہ گرد پروین شاکر کا ایک شعر اکثر پڑھتا ہے کہ:

دل تو کیا چیز ہے، ہم روح میں اُترے ہوتے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح!

سو چاہنے جیسے کو چاہنے والوں کی طرح نہ چاہنے والوں کی برادری کے ایک گم نام فرد کی طرح آوارہ گرد پروین شاکر کو فیض احمد فیض کا صرف ایک شعر سنانا چاہتا ہے:

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پر آئیں گے غم گسار چلے

☆......☆......☆

# ماضی۔ مستقبل اور ایدھی کا جھولا

اطلاعات کے مطابق جنگ کے شکار سرائیوو میں نوزائدہ بچوّں کے تناسب میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ سماجی، صحافتی اور طبی ماہرین اس کا سبب جنگ کی دہشت میں پھنسے ہوئے شہریوں کے پاس ''دوسری کوئی مصروفیت'' نہ ہونا بتا رہے ہیں۔ آوارہ گرد نے کہیں پڑھا تھا کہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں جب چلی میں سلوا دور آلندے کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر جنرل پنوشے نے دارالحکومت سانتیاگو میں پہلے ڈیڑھ ماہ تک چوبیس گھنٹے اور بعد ازاں آنے والے ڈیڑھ سال تک رات کا کرفیو نافذ کیا تو وہاں بھی بچوّں کی پیدائش کی تعداد کسی غریب ملک میں غربت کی طرح بڑھ گئی۔

آوارہ گرد کا شہر حیدر آباد بھی کرفیو اور اس دوران بچےّ پیدا کرنے میں سانتیاگو کی ہم سری کر چکا ہے۔ بچوّں کی پیدائش آوارہ گرد کی رائے میں دنیا کا ایک ایسا اچھوتا تجربہ ہے جو کروڑوں سال پرانا ہونے کے باوجود ہر مرتبہ نیا لگتا ہے۔ کسی بچےّ کے پیدا ہونے یا کسی حاملہ عورت کو دیکھنے والے پل آوارہ گرد کے لیے انتہائی رومانوی ہوتے ہیں تاہم اس کٹھور دنیا میں پیدا ہونے والا ہر بچہ اپنے ساتھ جمالیاتی مناظر یا ٹیگور کے بقول'' خدا کی انسانوں میں اُمید'' بھی نہیں لاتا۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ایدھی فاؤنڈیشن کو اپنے ہر سینٹر کے باہر ناجائز ماں باپ کے جائز

بچوّں کے لیے جھولا نہیں لگانا پڑتا۔ آوارہ گرد ایدھی ٹرسٹ کے رضا کار کے طور پر کام کرتے ہوئے ایسے کئی بچوّں کو جھولوں میں آتے اور انہیں سینٹروں پر یا بچوّں سے محروم کسی جوڑے کے پاس پلتے دیکھ چکا ہے۔

آوارہ گرد کو یاد آیا کہ اُس نے ایک مرتبہ سندھی زبان کے مہان افسانہ نگار امر جلیل کو فخر کے ساتھ بتایا تھا کہ اب ان کے افسانے ''زندگی ایک بھنور'' کی کردار ماں کو اپنے نوزائیدہ بچّے کو باپ کا نام دینے کے لیے کسی سیٹھ یا وڈیرے کے دروازے پر گڑگڑانا نہیں پڑے گا۔ اس بچّے کو ایسی ماں ایدھی سینٹر کے جھولے میں ڈال جائے کہ آوارہ گرد جیسا کوئی ''ماموں'' یا بچوّں سے محروم کوئی جوڑا اُسے گود لے کر، چمکتے کھلونوں اور کپڑوں، ٹافیوں اور لالی پاپ اور بے انتہا پیار سے اتنا مست کرے گا کہ اُسے پتہ ہی نہ لگے گا کہ وہ ان مست لوگوں کا بچہّ نہیں ہے۔

آرٹس کونسل کراچی کی فٹ پاتھ پر اُس رات امر جلیل نے آوارہ گرد کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ایدھی ٹرسٹ کے اس کام پر افسانہ یا کوئی ٹی وی ڈرامہ ضرور لکھیں گے لیکن آوارہ گرد کا خیال ہے کہ اُس دن بھی امر جلیل ایک دن قبل لیاقت نیشنل لائبریری میں ملنے والی پذیرائی کی جذباتی کیفیت میں تھے اور وہ ''رات گئی بات گئی'' کی طرح اپنا وعدہ بھول گئے!

وہ چاہے اپنا وعدہ بھول گئے ہوں لیکن ایدھی ٹرسٹ اور اُس کے آوارہ گرد جیسے رضا کاروں نے اپنی ریت نہیں بدلی ہے۔ وہ آج بھی ایسے بچوّں کو بار بار اپنے جھولوں میں دیکھتے ہیں، انہیں محفوظ ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے ہر ایک خطرہ مول لینے کو تیار رہتے ہیں۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ ۸۹۔۱۹۸۸ء میں جب کراچی شہر کا بڑا حصہ کرفیو اور گولیوں کی زد میں تھا تو ایسی ہی ایک رات ایک سینٹر پر ایک عورت ایک نوزائیدہ بچہ جھولے میں ڈال گئی۔ آوارہ گرد سمیت ڈیوٹی پر موجود دیگر دو اشخاص کو پتہ ہی نہیں تھا کہ ایسے بچوں کو متعلقہ لوگوں تک پہنچانے تک کس طرح سنبھالا جائے، سُو گھنٹوں کی عمر کے بچّے کو تینوں نے پہلے تو بالغوں والے لطیفے سنانا شروع کیے اور پھر اس احساس سے کہ بچّے کو بھوک لگی ہوگی، گولیوں کی بارش میں دودھ کی تلاش شروع ہوئی۔ آوارہ گرد کو اُس رات پہلی مرتبہ کسی انجان جگہ سے آنے والی گولی سے مارے جانے کے امکان کا ڈر نہیں تھا۔ اُس رات دودھ کی تلاش کے دوران ایدھی ٹرسٹ کے ایک نیم پاگل اور نیم فلسفی ڈرائیور نے آوارہ گرد کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا تھا:

''ڈرنا نہیں، آج رات ہمیں موت نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ یہ بچہ بالکل خدا جیسا لگتا ہے۔''

یہ ہمت ہے بس فقط ایدھی کی، جو مذہبی جنونیوں کے ملک میں جہاں ایسے بچوّں کی سزا فقط پتھر مار کر موت کی وادی کی سیر کرانا ہو، ایسے بچوّں کے لیے جینے کا پروانہ لاتا ہے۔

آوارہ گرد کی ہمیشہ سے شدید خواہش رہی ہے کہ وہ ہمیشہ بچہّ ہی رہے اور اس دنیا میں بڑا نہ ہوا جائے! جب سینما کی اسکرین پر "Time Cop" فلم کا ہیرو ماضی میں جا کر دس سال قبل قتل ہونے والی اپنی بیوی کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا تو ہال کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا آوارہ گرد بھی تصور میں اپنے ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ سائنس فکشن پر بننے والی یہ فلم ماضی کے واقعات کو مستقبل میں جا کر تبدیل کرنے سے متعلق ہے۔

اگر آوارہ گرد کو کبھی ماضی میں جانے کا موقعہ ملا تو وہ اپنے ایک صحافی دوست جاوید جیدی کی نظم لوگوں بالخصوص بچوّں کو منتیں کر کے سنائے گا۔ اسلام آباد سے شایع ہونے والے ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر اور اردو، سرائیکی اور پنجابی میں شاعری کرنے والے جیدی کی ایک نظم ہے کہ ''بچپن کی گلیوں میں جانا ہے اور اپنے سنگی ساتھیوں سے کہنا ہے کہ آگے مت جانا، آگے کچھ بھی نہیں۔''

جیدی کی بات ہے بھی تو درست! گزرے ہوئے کل سے آگے کم از کم آوارہ گرد کے ہم عصروں کے لیے تو کرب، دکھوں اور تکلیفوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس سے تو بہتر وہ دن تھے جب منھ بھی اماں دھلاتی تھیں اور بخار ہونے پر پسندیدہ بسکٹ ملتے تھے۔ آوارہ گرد تو اپنے ماضی کا ہر ایک دن یاد کرتا رہتا ہے۔ اگر ٹائیم کوپ والی گاڑی مل گئی تو ۱۹۶۲ء میں سرد دسمبر کے اُس دن سے ننھے منے آوارہ گرد کو دیکھنے کی ابتدا کی جائے گی جب اُس نے ایک عیسائی نرس کی نگہہ داری میں دنیا میں پہلی سانس لی تھی۔ آوارہ گرد کراچی اور حیدر آباد کے سابقہ پُرامن راستوں پر گھوم پھر کر مستقبل والے نوجوان کی ٹھرک پوری کرے گا۔ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کے دوران حیدر آباد میں چلنے والی ڈبل ڈیکر بسیں اور دو اور چار گھوڑوں والی بگھیاں آوارہ گرد کو بے انتہا بھاتی تھیں۔

بگھیوں کی ایک ہی وقت میں بڑی تعداد آوارہ گرد اُن دنوں بارہ ربیع الاوّل کو نکلنے والے جلوس میں دیکھتا تھا۔ اس جلوس کا بھی اپنا ایک رنگ تھا۔ سب سے آگے ڈھول اور شہنائی والے، اس کے بعد جدید طرز کا بینڈ، اس کے بعد کمہاروں کی گدھے گاڑیاں، گھوڑے گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں، ایک آدھ ہاتھی، موٹر سائیکلوں، کاروں، ٹرکوں اور بسوں کا ایک بے انت سلسلہ۔

اب تو یہ جلوس بھی فقط مذہبی ذمہ داری کا تسلسل بن گیا ہے، سماجی وابستگی تو کب کی ختم ہو چکی۔

آوارہ گرد اپنے جونیئر ایڈیشن کی پرائمری اسکول کے ایام کی تمام شرارتوں، کم زوریوں اور ڈر کو دیکھنا چاہے گا لیکن یار اپنے ایسے نصیب کہاں! نہ ایدھی کے جھولوں میں جھول پائے اور نہ کسی سائنسدان کی گاڑی کے ذریعے ماضی میں جانے کا موقع ملا! بس اپنے کونے میں تو جگجیت اور چترا کی گائی ہوئی غزل اور جاوید جیدی کی نظم اور جوانی کے آخری برسوں میں خالی راستے اور خالی کمرے ہی آئے ہیں!

☆......☆......☆

# گم نام کارکن اور تاریخ کی سرد ایش ٹرے

اس دن شہر کے ایک ہال میں ''کامریڈ نارائن داس بیچر'' کی برسی کے حوالے سے ایک پروگرام ہوا۔ آٹھ تنظیموں کی میز بانی میں ہونے والے پروگرام میں کوئی سو ڈیڑھ سو لوگ ہی شریک تھے۔ ماضی میں اپنے کسی دوست سے ''فنکشن برڈ'' کا لقب پانے والا آوارہ گرد بھی وہاں موجود تھا۔ اس پروگرام میں آوارہ گرد کے شریک ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ گم نام ''نارائن داس بیچر'' کون تھا؟ بس صاحب، اس سوال کا مکمل جواب پروگرام ختم ہونے تک بھی نہ مل سکا کہ مقرّرین یا میز بانوں کے پاس بھی اس کامریڈ سے متعلق معلومات موجود نہیں تھیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ کامریڈ کسی یونین کے صدر یا جنرل سیکریٹری تھے اور شہر میں اٹھارہ عمارتیں اُن کی ملکیت تھیں، اس سے زیادہ نہیں تھیں۔

آوارہ گرد طویل عرصے سے دوستوں یاروں کو کہتا رہا ہے کہ شخصیات کا بھی ریکارڈ ہونا چاہیے کہ کس نے کیا کیا؟ لیکن صاحب! آوارہ گرد کو محسوس ہوا ہے کہ شاید ایسا کرنے سے کچھ افراد، تنظیموں، اداروں کی ''دکانیں'' بند ہو جائیں گی۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ کامریڈ جام ساقی کو جیل سے اسپتال منتقل کرنے کی مہم کے دوران امدادی ٹوکن فروخت کرنے والا نبی بخش ہمدرد جب گردے خراب ہونے کی وجہ سے بیمار ہوا اور بعد میں مر بھی گیا تو کسی نے اسے بچانے کے لیے کوئی علاج معالجہ نہیں کرایا اور نہ اسے یاد رکھنے کے لے برسیاں منائی گئیں ورنہ پروفیسر رام

پنجوانی کی طرح سندھ کے شہروں اور گاؤں میں ماچس کی ڈبیہ پر ساز بجا کر انقلابی یا قومی گیت گانے والا نبی بخش ہمدرد یا ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں میں آنے والے سیاسی ابھار کے دوران ٹنڈوالہ یار کے قریب کسان عدالتیں قائم کرنے والا کامریڈ احمد لغاری کچھ اتنے بھی بے نام نہیں رہے ہیں!

اب تو کسی کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ اپنے نظریے پر ثابت قدم رہنے والے سنجیدہ نوجوان شیر محمد مگریو نے انتہائی خاموشی سے کوڑے کھائے تھے اور کسی کو بھی اس کے متعلق بتایا بھی نہیں۔ شیر محمد سے متعلق آوارہ گرد کا نہ جانے کیوں خیال ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کے شاعر رشم کی نظم کا جیتا جاگتا کردار ہے، جس میں وہ کہتا ہے، جب ہمارا قافلہ پہاڑی سلسلہ پھلانگ رہا تھا اور پہاڑی نالے پر پُل بننے کے لیے میں سینے کے بل لیٹ گیا تو میرے ساتھی میرے اوپر سے گزرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ وہ کم گو کہاں گیا جو دعوے کر رہا تھا کہ آخر تک ساتھ نبھائے گا۔ اس پر دوسرے ساتھی نے کہا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ ساتھ نہیں نبھائے گا، بھاگ جائے گا......!

بس یار! نام ان کا روشن رہتا ہے جن کی کوئی زوردار لابی ہے یا حسن مجتبیٰ کے بقول جو انگلش میڈیم سے پڑھ کر آئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حیدر بخش جتوئی کے ساتھ عنایت اللہ ''دھمچر'' کو یاد رکھا جاتا، سجاد ظہیر کے ساتھ کامریڈ دوشنبے کا بھی نام ہوتا اور کوئی گورا قبرستان کے مجاور کے ساتھ رہنے والے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے اس ناراض کارکن کی وفات کی تاریخ بھی اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جو کسی دور دراز شہر سے پارٹی کام کے سلسلے میں کراچی آ پہنچا تھا لیکن پارٹی سے اختلاف کی وجہ سے لاوارث بن گیا۔

گم نام لوگوں کے ذکر پر آوارہ گرد کو یاد آیا کہ کئی سال پہلے اس نے جنگ اخبار میں پیر علی محمد راشدی کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں اس نے ہوسٹری کے قریب رہنے والی پنھور برادری کے کچھ افراد کو انگریزوں کے دور میں الہ آباد جیل میں پھانسی لگنے والے شہید اشفاق اللہ خان کا ساتھی بتایا تھا۔ اس مضمون کے مطابق ان میں سے کئی ایک کو کالے پانی کی سزا بھی ہوئی تھی۔ آوارہ گرد کو یاد پڑتا ہے کہ اس کی ایک اَن پڑھ رشتہ دار خاتون نے اسے بتایا تھا کہ پتّے کی بیٹری بنانے والا اس کا بھائی بھی کسی زمانے میں گاندھی کی پارٹی (انڈین نیشنل کانگریس) میں شامل ہو کر چرخہ کاتتا اور انگریزوں کے خلاف بولتا رہتا تھا۔

لیکن ان اور ان جیسے کئی گم نام لوگوں پر تحقیق کرنے یا لکھنے والا کوئی نہیں۔ آوارہ گرد اپنی ہاتھی جیسی یاداشت دوڑاتا ہے تو سندھی میں اسے اس کے متعلق تین چار تحریریں ہی نظر آتی ہیں۔ عبدالواحد آریسر کی کتاب ''سر میں سانجھی ویڑ'' (منجد ہار میں سانجھ سے) پیر علی محمد راشدی کا ایک مضمون، پرچو ددیارتھی پر لکھی شیخ ایاز کی کچھ سطریں اور قرۃ العین حیدر کے سندھی ترجمے ''قلندر'' میں مترجم مدد علی سندھی کا انتساب۔ گم نام سیاسی کارکنوں پر کوئی اور تحریر ہو تو قاری آوارہ گرد کے اس متعلق ضرور بتائیں......!

بس صاحب! ہمارا پورا معاشرہ ''نطشے کا پڑوسی'' بن گیا ہے، جس میں کوّا ''بیلے ڈانسر'' اور شہزادے ''الو'' بن گئے ہیں۔ نطشے کے پڑوسی کی بات ہے تو کچھ جملوں میں، لیکن ہمارے آج کل کے حالات سے مطابقت رکھتی ہے۔ ہوا یہ کہ اپنی زندگی میں ہی اپنے معاشرے میں احترام حاصل کرنے والا نطشے ایک مرتبہ بس میں کہیں جارہا تھا کہ اپنے ہم سفروں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس پر نطشے کی قریبی نشست پر بیٹھا مسافر پھول گیا جیسے نطشے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اور لوگ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ آج کی جرمنی کی دانش ورانہ دنیا میں ''دونمبری لوگ'' نطشے کے پڑوسی کا لقب پاتے ہیں۔

آوارہ گرد کو بھارتی آرٹ فلم ''پارٹی'' یاد آرہی ہے، جس میں ایک جدو جہد کے دوران ہونے والے تشدّد کا چشم دید گواہ صحافی جب شہر کے ''چائے کی پیالی میں طوفان لانے والے'' دانش وروں کو جدو جہد کے دوران ہونے والی زیادتیوں اور عام یا گم نام افراد کے قتل عام کے تفصیل بتاتا ہے تو وہ ''دانش ور'' تیزی سے شراب کے جام بھر کر اپنا غم غلط کرتے ہیں۔ اس کے بعد صحافی (اوم پوری) کے جذباتی ڈائیلاگ ہماری بے حسی کا بھر پور اظہار کرتے ہیں۔

آوارہ گرد کی خواہش ہے کہ تاریخ کے بے رحم چرخے کے ہاتھوں موت کی مات کھانے والے کارکن کرشن چندر کے ناول ''برہم پترا'' کے بوٹ پالش کرنے والے لڑکے کی طرح Name less اور Face less ہو کر ''تاریخ کی سردایش ٹرے'' میں نہ پڑیں۔

# سفر کی ریکھا

مصور احمد زوئے پر ایک انگریزی جریدے میں لکھتے ہوئے جلیس حاضر نے آوارہ گرد کی کئی دبی ہوئی خواہشیں جگا دی ہیں۔ آوارہ گرد کو لاہور میں رہتے ہوئے جن نئے لوگوں سے اپنائیت ملی ان میں جلیس بھی ایک ہے۔ آوارہ گرد کی طرح اکثر پھٹی ہوئی جین اور بڑھی ہوئی شیو والا جلیس اُن دنوں لاہور کے ایک انگریزی اخبار کے میگزین شعبہ میں کام کرتا تھا۔ آوارہ گرد کی ''آئیڈیل زندگی'' کا ایک پہلو پورا کرتے ہوئے وہ یہ نوکری چھوڑ چکا ہے۔

سو، احمد زوئے کی نمائش پر اُس نے لکھا ہے کہ زوئے نے ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ایک امریکی ہپی سے متاثر ہو کر دنیا گھومنے کا سفر شروع کیا اور یورپ، اسکنڈی نیویا، مشرق بعید کے ممالک اور بھارتی جیل دیکھنے کے بعد بھی اُس کا سفر کسی منزل تک نہیں پہنچا ہے۔ زوئے اس دوران اپنی زبان سننے یا بولنے کے لیے بار بار لاہور پڑاؤ کے لیے آتا رہا ہے۔

جلیس کی یہ تحریر بہ ہر صورت آوارہ گرد کے ایک پسندیدہ جملے کی تصدیق ضرور کرتی ہے کہ ''دنیا قلندر کی چٹیا سے بھی مختصر ہے۔'' دنیا گھومنا آوارہ گرد کا وہ سپنا ہے جو تا حال پورا نہیں ہوا ہے البتہ اپنے Day Dreams میں وہ اتنی مرتبہ دنیا گھوم چکا ہے کہ مارکو پولو، ابن بطوطہ یا الطاف شیخ حقیقت میں بھی نہیں گھوم سکے ہوں گے۔

آوارہ گرد کی پسندیدہ مصنفہ عینی (قرۃ العین حیدر) کے کئی کردار آوارہ گرد کو محض اس

لیے بھی اچھے لگتے ہیں کہ وہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ عینی کے ایک افسانے ''آوارہ گرد'' کا مرکزی کردار ایک یورپی آوارہ گرد ہے، جو افسانے کے راوی کو کراچی میں ملتا ہے اور جس کے لیے کھانا کھانے یا سیّاحتی محکموں کے مشہور کیے جانے والے مقامات سے زیادہ اہم کھوڑی گارڈن اور آرام باغ ہیں۔ دہلی میں چنے اور کیلے کھا کر پانی کا گلاس پی کر گھومنے پھرنے والا یہ آوارہ گرد جب دو گروہوں کے ٹکراؤ والی سرزمین ویتنام پہنچتا ہے تو عینی اپنی بے رحمی سے کام لے کر اُسے کسی اَن دیکھے ہتھیار سے داغی جانے والی گولی سے مروا دیتی ہے۔

عینی کے دوسرے افسانے ''قلندر'' کا اقبال بھی ''صبح بنارس، شام اودھ'' کا عملی روپ بن کر، دنیا بھر میں گھومتا رہتا ہے۔ ''قلندر'' میں عینی نے اقبال کو ایک ایسے ''جگر'' شخص کے روپ میں پیش کیا ہے جو دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی ذات، دھرم یا وطن کا بھی مذاق اڑاتے ہوئے نہیں چوکتا۔ آوارہ گرد کی یہ پرانی خواہش رہی ہے کہ ستر کی دہائی کے ہپّیوں یا قدیم دور کے ہندوستانی جوگیوں سنیاسیوں کی طرح گھوما پھرا جائے اور اس عمل کے نظریاتی معتقد ہونے کے ثبوت کے طور پر اُس نے کبھی بھی اپنا گھر نہیں بنایا اور غالب کے شعر

دیر نہیں، حرم نہیں، گھر نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

کا عملی مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ آوارہ گرد مذہبی علما اور صوفیوں کی اس بات سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے، جہاں سے صبح ہوتے ہی سرائے کا مالک یا منیجر آپ کو نیند سے اُٹھا دے گا، پھر چاہے آپ کینز کا فلمی میلہ دیکھ رہے ہوں یا اپنے کسی جانی دوست کے ساتھ کسی پسندیدہ ہوٹل پر کولڈ کافی پی رہے ہوں۔ پھر اگر زندگی ہے ہی چار دن کی تو پھر اس میں سے ''دو آرزو میں اور دو انتظار میں'' کیوں گزارے جائیں۔ احمد زوئے کی طرح بیگ کندھے پر رکھ کر دنیا کیوں نہ گھومی جائے!

آوارہ گردی کے حوالے سے آوارہ گرد نے کبھی بھی دوبارہ سوچا ہی نہیں، پھر چاہے ایدھی والوں کے ساتھ جامشورو لاڑکانہ روڈ پر سفر ہو یا سرنگوں سے بھرے ہوئے پشاور، پنڈی روڈ پر سفر کرنا ہو، آوارہ گرد ہر وقت ہر حالت میں تیار ہوگا۔

بچپن میں سفر کی اتنی خوشی ہوتی تھی کہ صبح نیند سے جلدی اور اپنے طور پر اٹھنے کو اپنے لیے گالی سمجھنے والا آوارہ گرد ہر ایک سے پہلے نیند سے اٹھ کر دوسروں کی نیند خراب کرتا تھا۔

اگر چہ آوارہ گرد نے شیخ ایاز کی طرح ریل گاڑی سے جھانکتی ہوئی، خود پر عاشق ہونے والی کوئی عورت نہیں دیکھی تاہم ریلوے اسٹیشن پر گھنٹوں بیٹھے رہنا آوارہ گرد کی بچپن سے من پسند مصروفیت رہی ہے۔

آوارہ گردی پر یاد آیا کہ آوارہ گرد کے ایک پامسٹ دوست نے ایک دوست کے ہاتھ کی ریکھا دیکھنے کے بعد اُسے بتایا تھا کہ وہ سفر پر جا رہا ہے۔ سفر کی ریکھاؤں والا دوست چودہ سال سمندری جہازوں پر کام کرتے کرتے اتنا تھک گیا تھا کہ اُس نے پل بھر میں جواب دیا کہ ''یار! بہت تھک گیا ہوں، بس اب سفر نہیں ہوگا۔'' لیکن کچھ دنوں میں ہی پامسٹ یار کی بات درست نکلی اور سفر سے تنگ یار پردیس چلا گیا۔ وہاں اُسے پانچ سال کا ویزا مل گیا اور اب تو اُس نے وہاں شادی بھی کر لی ہے۔

آوارہ گرد کو یاد ہے کہ اُس نے پامسٹ یار کی اکثر منّت سماجت کی ہے کہ ''یار! میرے ہاتھ میں بھی سفر کی کوئی ریکھا ڈھونڈو!'' ریکھاؤں پر یاد آیا کہ امرتا پریتم کے اُن دنوں کے مصوّر دوست امروز کو کسی پامسٹ نے بتایا تھا کہ اُس کی ہاتھ ریکھاؤں میں امرتا سے سنجوگ نہیں ہے۔ اس پر امروز نے بلیڈ سے اپنی ہتھیلی چیرتے ہوئے پامسٹ سے کہا تھا کہ ''اب تو ہوگئی، امرتا سے سنگم کی ریکھا!'' اور پھر امرتا اور امروز کا ایسا سنگم ہوا کہ بے مثل! امروز تو ہے کاغذ کے کینوس پر زندگی نقش کرنے والا لیکن آوارہ گرد بھی سفر کی ریکھا کے لیے کسی بلیڈ سے اپنی ہتھیلی پر چیرا لگانے کو تیار ہے!

# چُھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

اخبارات میں شایع ہونے والی خبر کے مطابق ڈاکٹر ارباب کھاوڑ اپنے دوستوں سمیت پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے ہیں۔ اخبارات میں یہ واضح نہیں کہ سابقہ کمیونسٹ رہنما ارباب کھاوڑ کے ساتھ پارٹی میں ان کے پرانے مارکسی دوست شامل ہوئے ہیں یا کہ ''نئے'' دوست۔ آوارہ گرد بھی ارباب کھاوڑ کے ''پرانے دوستوں'' میں سے ایک رہا ہے۔

اسّی کی دہائی میں جنرل ضیا کے مارشل لا کے ایّام میں سندھ میں احساسِ محرومی کے عہد میں جو رہنما اپنا تھوڑا بہت نام پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے، اُن میں ڈاکٹر ارباب کھاوڑ بھی شامل تھے۔ جنرل ضیا کی مارشل لا بھی ''رنگی کا رنگ'' تھی۔ عوام شہید بھٹو اور پیپلز پارٹی کے پرستار اور معتقد تھے تو پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی اکثریت ''سر بچاؤ مہم'' میں مصروف تھی۔

عوام کی کسی حد تک رہنمائی کرنے کے لیے مارشل لا کے سخت ایام میں چھوٹی چھوٹی کمیونسٹ پارٹیاں یا گروہ ٹیگور کے جملے ''اندھیرے کو برا بھلا کہنے سے بہتر ہے کہ ایک دیپ جلایا جائے'' کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے سرگرمیاں کر رہی تھیں۔ اگر چہ ان کمیونسٹ گروپوں کے کارکنوں کی تعداد ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک تقریباً یکساں ہی رہی تاہم ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل سے لے کر محمد خان جونیجو کی غیر جماعتی نیم جمہوری حکومت کی تشکیل تک یہ گروہ روز بہ روز زیادہ مشہور ہوتے گئے۔

آوارہ گرد بھی اُن ہزاروں نوجوانوں میں سے ایک تھا جو بھٹو کے قتل کے ردعمل کے طور پر سیاست کی طرف بڑھے اور جا کر کمیونسٹوں کے در پر پہنچے۔ اُن دنوں کا کمیونسٹ کلچر بھی عجیب تھا، مشہور ترین کمیونسٹ رہنما جام ساقی سے لے کر شبیر شر تک، اور ڈاکٹر فیروز احمد سے لے کر ہیرالال واگھیلا تک ہر کمیونسٹ کارکن کا خیال تھا کہ وہائٹ ہاؤس تو کیا بلکہ پینٹا گون اور سی آئی اے ہیڈ کوارٹرس میں نصب مشینوں کے ذریعے ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔

اُن دنوں کمیونسٹ کارکن ہر جلسے جلوس تو کیا خالص دانش ورانہ محافل اور مشاعروں میں بھی شور شرابا کر کے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے تھے۔ آوارہ گرد سمیت کئی نوجوان نعرے بازی کر کے دوسروں کے جلسے خراب کر کے یہ محسوس کرتے تھے کہ اُن دنوں کے ایک مشہور نعرے ''چھینو چھینو پاکستان، جیسے چھینا افغانستان'' پر عمل کا پہلا مرحلہ اسی طرح طے ہوگا۔ پھر اکثر پڑتی تھی مار یا لاٹھیاں! سرکار نامدار اور اس کی ''ایجنٹ'' جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ اور کبھی کبھار جساف بھی جسمانی تھکاوٹ نکال دیتی تھیں۔

آوارہ گرد ۱۹۸۵ء میں حیدر آباد میں منعقدہ یکم مئی کا وہ جلسہ کبھی نہیں بھول سکتا جو ہوا تو کمیونسٹوں کی میز بانی میں تھا لیکن مزدوروں نے کچھ نوجوانوں کی غیر جماعتی اسمبلی کے کارکن میر حیدر تالپور کی موجودگی کے خلاف نعرے لگانے پر اچھی خاصی پٹائی کی تھی۔ اُن دنوں کے ''انقلاب کے ہراول دستے'' مزدور طبقے کے ہاتھوں مار کھانے والے آوارہ گرد سمیت تین نوجوانوں نے تب بھی کمیونزم اور انقلاب سے اپنے عہد وفا کی تجدید کرتے ہوئے محض کچھ رہنماؤں کو اس انقلاب دشمن حرکت کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے مزدوروں کو ''تاریخی فرض سے غافل'' سمجھا تھا۔

اُن دنوں انقلاب سے عشق کی یہ حالت تھی کہ ہر کوئی اپنا گھر گھاٹ اور بال بچے چھوڑ کر قریہ قریہ لوگوں میں انقلاب کی تبلیغ کرتا تھا یا جیل کی رونق بڑھاتا تھا۔ اُن دنوں کا کوئی بھی ایسا انقلابی قیدی آوارہ گرد کے نوٹس پر نہیں جس نے کھلے عام مایوسی کا اظہار کیا ہو تاہم یہ بات الگ ہے کہ ان رہنما قیدیوں کی اکثریت جیلوں سے رہا ہونے کے بعد یا تو سیاست چھوڑ گئی یا پھر ''کسی دوسرے سفر کی راہی'' بنی۔

آوارہ گرد کو حیدر آباد کا وہ پُرجوش کامریڈ یاد آ رہا ہے جس نے ساٹھ کی دہائی میں حیدر آباد کا دورہ کرنے والے امریکی سفیر پر کرسی پھینک کر حملہ کیا تھا اور جب اس کامریڈ کی

ماں کا انتقال ہوا تو وہ پارٹی کامریڈوں سے یہ پوچھنے گیا کہ کامریڈ کس وقت فارغ ہوں گے کہ وہ اپنی ماں کی تدفین کا بندوبست کرے لیکن کامریڈوں نے ہمیشہ کی طرح اپنے ''مادّی رویے'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ تو اس سے اظہار ہمدردی کیا اور نہ ہی جنازے میں شرکت کو ضروری سمجھا۔ یہ سابقہ کامریڈ اپنے ''سرخ ساتھیوں'' سے اُس دن جو گیا تو پھر پلٹ کر کبھی نہیں آیا۔

آوارہ گرد نے ایک ایسے مزدور رہنما یا کمیونسٹ کارکن کا کرب بھی اچھی طرح محسوس کیا ہے، جس کی بیوی اُس کے بار بار جیل جانے اور غربت کے حالات کو برداشت نہ کرکے طلاق لے لی۔ یہ رکشہ ڈرائیور سابقہ کامریڈ کچھ عرصے تک تو بیوی اور بچوّں سے دوری کی اس واردات کو انقلاب کے لیے اپنی ''چھوٹی سی قربانی'' کہتا رہا لیکن اب جب ''چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا'' جیسی صورت حال ہے تو یہ یار بھی اپنے فیصلے کو غلط کہنے سے نہیں ہچکچاتا۔

کمیونزم کے لیے جدو جہد کو سمجھنے کے لیے آوارہ گرد کا خیال ہے کہ دو بھارتی فلمیں ''نکسلائیٹ'' اور ''پارٹی'' ضرور دیکھی جائیں۔ یہ دونوں فلمیں دیکھ کر آوارہ گرد کو سندھ میں کام کرنے والے کمیونسٹ گروپوں کے اکثر لوگوں کے رویے سمجھ میں آئے۔ آوارہ گرد کو کمیونسٹ کلچر کی عادتیں اور رویے تقریباً ہر جگہ ایک جیسے ہی نظر آئے۔ آوارہ گرد کی رائے میں دیسی کامریڈوں کی ناکامی کا اہم ترین سبب ان کے پاس انسانی اقدار اور رویوّں کی عدم موجودگی ہے۔ کمیونسٹ رہنماؤں نے ''عام لوگوں'' کی تو انقلاب پر بلی چڑھائی لیکن اپنے بچوّں اور رشتہ داروں کو کمیونسٹ بلاک کے ممالک بھیجتے رہے اور گوری چمڑی کے ذہنی غلام دیس کے یہ ''اشرافیائی بچے'' جب واپس لوٹ کر آئے تو ان کا حال بھی وہی تھا جو کراچی کی اسٹیل ملز کے اُس مسکین سندھی کا تھا جسے ایک روسی عورت کو Rape کرنے کے الزام میں ملازمت سے برخاست کیا گیا تو اُس کا کہنا تھا، ''ٹھیک ہے، ملازمت گئی تو کیا ہوا گوری کے ساتھ سوئے تو!''

بس صاحب! اسّی کی دہائی کی ''کمیونسٹ وبا'' نے کچھ کے نصیب بنائے تو کئی ایک کے بگاڑے! اُن دنوں کمیونسٹ سیاست میں داخل ہونے والوں کو آوارہ گرد کچھ حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کچھ سماجی مسائل سے رومانوی رویے کی وجہ سے آئے، دوسرے کمیونسٹوں کو مشرقی یورپ کے ممالک جانے کے لیے سیڑھی بنانے آئے۔ تیسرے، بالخصوص دیہی علاقوں سے شہر آنے

والے رنگروٹوں نے کمیونسٹ گروپوں کو اپنے سماجی میل جول یا شہری لڑکوں یا لڑکیوں سے شادیاں کرنے کا ذریعہ بنایا۔

آوارہ گرد کی رائے ہے کہ پاکستان بالخصوص سندھ میں کمیونزم دیوارِ برلن گرنے سے نہیں بلکہ جنرل ضیا کا جہاز گرنے سے بوکاٹا ہوگیا۔

☆......☆......☆

# سیمنٹ کے چبوترے پر کتّے کا پنجہ

بھاولپور کے ریلوے اسٹیشن پر ریل گاڑی رکی تو آوارہ گرد کی ایک پڑھی لکھی ہم سفر خاتون نے اپنے نواسے کو بتایا کہ یہ بھاولپور ہے جہاں جنرل ضیا کا جہاز تباہ ہوا تھا۔ جنرل ضیا کا نام سنتے ہی کچھ دیر تک تو آوارہ گرد ایک بار پھر ڈر گیا لیکن کچھ سنبھلنے کے بعد اُسے یاد آیا کہ ۱۷/اگست ۱۹۸۸ء کو بھاولپور سے کچھ دور، انورسن رائے کے گاؤں خیر پور ٹامے والی کے قریب جنرل ضیا کا جہاز زوردار دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔

آوارہ گرد کے ٹین ایجز قارئین کئی سال قبل ہلاک ہونے والے شخص ضیاء الحق سے ابھی تک ڈرنے کی بات شاید حیرت انگیز لگے لیکن اُس دن محترمہ بے نظیر بھٹو کا بیان کہ ”ہم میں سے بہت سوں کے سر سے موت ٹل گئی“، آوارہ گرد کے جنوری ۱۹۹۵ء میں ڈرنے کی دلیل کے لیے کافی ہے۔

آوارہ گرد کے ہم عمر ساتھیوں میں سب سے پیارے اور نفیس شاعر حسن درس نے ضیاء پر اپنی ایک نظم میں کہا تھا کہ ”جنرل ضیاء تم زندگی کے لیے ”منع نامہ“ ہو...... کپاس جیسی جوانیوں پر گرا ہوا بھاری پتھر ہو!“

آوارہ گرد کے ساتھ بڑی ہونے والی نسل یا اُس سے پہلے مارشل لا بھگتنے والی نسل کے لیے جنرل ضیاء نفرت اور دہشت کی ایک ایسی علامت ہے جسے وہ شاید پوری زندگی بھول نہ

سکے۔

آوارہ گرد اپنے بچپن میں ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری آزادیوں کے دور کی جو دُھندلی یادیں یاد کر پاتا ہے اُن میں سے ایک اس کی نور محمد ہائی اسکول کی دیوار کے ساتھ واقع مسلم کالج میں ہر سال ہونے والے طلبہ یونین کے انتخابات کی رنگا رنگی بھی ہے لیکن آوارہ گرد کے میٹرک میں پہنچنے سے قبل ہی جنرل ضیاء اقتدار پر قابض ہو چکا تھا اور طلبہ یونین کے انتخابات تو کیا خود تعلیمی ادارے ہی ختم یا بند ہونا شروع ہو گئے۔

عثمان غنی، ادریس طوطی، ناصر بلوچ اور نذیر عباسی جیسی اَن گنت ''کپاس جیسی جوانیوں پر موت کا بھاری پتھر'' گر پڑا اور اُن دنوں کی بین الاقوامی دیو مالائی شخصیت ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی کے لیے بلیک وارنٹ کی صورت میں ''منع نامہ'' جاری کیا گیا۔

ملک میں مارشل لا کیا آیا جیسے چڑیل ناچنے لگی۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو جنرل ضیا کی لاہور ہائی کورٹ نے بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی تو کچھ دیر کے بعد ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے نور بانو کی آواز میں حاجی شاہ کا سندھی کلام نشر ہوا'' میرے آئے نہیں محبوب، مجھ سے تو عہد کر گئے تھے!'' پھر اُس دن دوپہر کو آوارہ گرد سمیت اَن گنت ٹین ایجرس فاقے پر تھے کہ عورتیں رونے میں مصروف تھیں تو مرد کچھ نہ کر سکنے کے احساس شرمندگی میں۔ آوارہ گرد بھی اُن دنوں بچپن اور جوانی کی دہلیز پر کھڑے اُن اَن گنت لوگوں میں سے ایک ہے جن کا رومانس اور رشتہ داروں اور پڑوس کی لڑکیوں سے متعلق بات چیت کرنے کا وقت پہلے بھٹو کو بچانے کی جدوجہد میں اور بعد ازاں ٹھوس سیاسی بحث و مباحثے میں گزرنے لگا۔

مارشل لا کے ایام میں جلا وطنی کے دن یورپ میں گزارنے والے ایک سیاسی کارکن نے آوارہ گرد سے جب یہ کہا کہ وہ اگر ملک میں رہتا تو شاید مارا جاتا تو آوارہ گرد نے اُس سے کہا تھا، ''یار! ہم جو یہاں رہتے رہے وہ تو ہر دن ہر پل موت کی تنی ہوئی بندوق کے ہدف بنے رہے۔'' آوارہ گرد کی رائے میں جسمانی موت کوئی بڑی بات نہیں لیکن جنرل ضیاء کے مارشل لا میں جس طرح انسان کے انسان ہوئے اور عزتِ نفس کو کچلا جا رہا تھا وہ شاید آج کی نسل کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ اس دوران ایک پوری نسل کو مجموعی دھارے سے یوں کاٹ کر علیحدہ کیا گیا کہ اُن دنوں جوان ہونے والے نوجوان آج تک ذہنی طور پر اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکے ہیں۔

بہ ہر حال وہ دن اپنے طور پر فخر بھرے بھی تھے، جب یعقوب پرویز کھوکھر نے ''ایلی ایلی لما سبکتنی'' کا ورد کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے خود کو جلایا تو کئی آنکھوں اور سینوں نے خون کے آنسو روئے تھے اور اُن دنوں ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر ٹنڈو ولی محمد حیدر آباد میں چاٹ کا ٹھیلہ لگا کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والا ہر شخص کچھ لوگوں کی نظر میں قابل عزّت اور دوسروں کے پاس قابلِ گردن زنی تھا۔ اُن دنوں سیاسی کارکن تو کیا بی بی سی کا مارک ٹیلی اور لاہور ہائی کورٹ میں پہنچنے والا میجر رشید بھی ''باہمّت'' سمجھے جاتے تھے۔ اُن دنوں آوارہ گرد کے ہم عصر جیل اس طرح جاتے تھے جیسے بُردکھاوے کے لیے جارہے ہوں! اور اُن دنوں سیاسی بنیاد پر ایک دن یا بیس سال کی سزا بھگتنے والے سیاسی قیدیوں سے متعلق عام لوگ بالکل ویسا ہی رویہ رکھتے تھے جیسے وہ کسی بڑے دیو کو مار کر اُس سے شہزادی کو رہا کرانے کی کوشش میں ہوں۔

مارشل لا کی سختیوں نے جہاں ''ڈھیسر سندھ'' اور ''شیر پنجاب'' جیسے القاب رکھنے والوں کو اُڑن چھو کر دیا وہاں ''اٹک اور لاہور کے قلعوں'' کے فاتح بھی پیدا کیے۔ آوارہ گرد کو سیاسی کارکن شاہدہ جبین یاد آرہی ہے جس کے بھائی عثمان غنی کو پھانسی چڑھانے کے بعد خود شاہدہ کو شاہی قلعے میں تشدّد کا نشانہ بنایا گیا لیکن وہ آج تک سینہ تان کر اپنے سیاسی کارکن ہونے کا بہ بانگ بلند اعلان کرتی ہے۔

مارشل لا کی مزاحمت پر آوارہ گرد کو چلی کی یاد آرہی ہے جہاں جنرل پنوشے کا مارشل لا مسلّط ہونے کے بعد مارشل لا مخالف گروہوں نے مشترکہ طور پر طے کیا کہ ''شور کیا جائے گا!'' سوسانتیا گو کے ہر شہری نے شور کرنا شروع کیا۔ ڈرائیوروں نے گاڑیوں کے ہارن بجانا شروع کیے تو عورتوں نے گھر کے برتن بجائے۔ آوارہ گرد کے جیسے لوگوں نے جن کے پاس نہ گاڑی تھی اور نہ گھر کے برتن، بجلی کے کھمبے لاٹھیوں، پتھروں اور خالی ہاتھوں سے بجانا شروع کیے۔ کہتے ہیں کہ اس شور کی وجہ سے جنرل پنوشے دارلحکومت سے بھاگ گیا تھا! آوارہ گرد کے دیس والوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ جب مارشل لا کے ابتدائی ایام میں اخبارات پر سنسر شپ لگائی گئی تو سنسر ہونے والی خبروں کی جگہ بالکل خالی آنے لگی اور ان دنوں حکومت مخالف اخبارات (مساوات، صداقت اور امن) خبروں کے بغیر بھی فروخت ہوتے رہے تو یہ شاہی حکم آیا کہ سنسر شدہ خبروں کی جگہ پُر ہونی چاہیے تاہم آوارہ گرد کی اُن دنوں کی برادری نے بھی اپنا

رنگ دکھایا۔ ہوا یہ کہ ایک دن اردو اخبار حریت کا اداریہ سنسر ہوگیا تو اس صفحہ کے انچارج نے جگہ پُر کرنے والے حکم کو مانتے ہوئے وہاں اونٹ کی تصویر لگادی!

آوارہ گرد جنرل ضیا کے منعقدہ ریفرنڈم کے دوران ٹی وی پر آن ایئر آنے والا کسی کا یہ جملہ بھول نہیں سکتا کہ ''پولنگ اسٹیشنوں پر لوگ ہوں تو دکھائیں۔'' یا ریڈیو اسٹیشن حیدر آباد کے اُس پروڈیوسر کا اُن دنوں بہت چرچہ تھا جس نے پانچ جنوری کو ذوالفقار علی بھٹو کے جنم دن پر ''سالگرہ کا دن آیا ہے'' والا فلمی گانا چلا کر اپنی نوکری گنوائی تھی!

آوارہ گرد کی تجویز ہے کہ ضیا شاہی پر تمام متعلقہ لوگ لکھیں، کیوں کہ ان دنوں کے ہر ایک کے پاس الگ الگ تجربات، کرب اور حوصلے ہیں۔ آوارہ گرد کو محرّم کی مجلس کے دوران سیاہ کپڑے پہنے ہوئے وہ شخص بھی نہیں بھولتا جس نے جنرل ضیا کے مرنے پر مٹھائی تقسیم کرتے ہوئے کہا تھا کہ، ''اماموں کے غم کے دنوں میں خوشی منانے کا گناہ تو مولا سے ہاتھ باندھ کر معاف کرائیں گے لیکن آج خوشی کی مٹھائی ضرور تقسیم کریں گے!'' آوارہ گرد کو وہ مذہبی شخص بھی یاد ہے جس نے جنرل ضیا (بہ قول کچھ لوگوں کے آرنلڈ رافیل) کے جنازے پر اپنے مرشد کو دیکھ کر بے ساختہ گالی دی تھی۔

بہر حال آوارہ گرد کی رائے ہے کہ جنرل ضیا، ہمارے انتہائی حسّاس دوست صریر پنھور کی نظم کے مطابق آمروں کی تاریخ میں اس طرح زندہ رہے گا، جیسے ''سیمنٹ کے تازہ بنے ہوئے چبوترے پر کتے کا پنجہ!''

☆......☆......☆

# ایک گلوکار کا قتل

پچھلے ہفتے ایک مذہبی جنونی ٹولے نے مشہور الجزائری گلوکار بابا احمد کو قتل کر دیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخری برسوں میں مشہور ہونے والی ''رائے سنگیت'' کے اہم پیروکار اور ''راشد'' کے نام سے نوجوانوں کے دلوں پر راج کرنے والے اس فن کار کے جنازے میں اخباری اطلاعات کے مطابق ہزاروں سوگ واروں نے شرکت کی اور ان میں سے کئی ایک پچھلے چند برسوں سے ملک میں بھڑکتی مذہبی جنونیت کے ذمہ دار افراد کو سزا دینے کے حق میں نعرے بھی لگا رہے تھے، الجزائر اس دکھ میں تنہا نہیں، پھر چاہے آوارہ گرد کے دیس میں بھگت کنور رام کا مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں قتل ہو یا کسی بیمار ذہن کے عالم کی انا پر خانم گوگوش کا بلیدان ہو۔ فن کار ہر دور میں کٹھور دلوں، نفرت بھری نگاہوں اور خنجر بھرے ہاتھوں کا شکار ہوتا رہا ہے۔

آوارہ گرد سولہویں صدی کی اُس فرانسیسی فن کار کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کے دور میں ناٹک ایک ''شیطانی کھیل'' سمجھا جاتا تھا اور جب اُسے بستر مرگ پر ایک پادری نے ناکردہ گناہ کی معافی مانگنے کے لیے کہا تو اُس نے جواب دیا تھا ''میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کا سب سے نیک کام نائب اللہ (انسان) کی دل جوئی ہے اور میں نے انسانوں میں خوشی کے اتنے لمحے تقسیم کیے ہیں کہ اگر پوری دنیا میں اپنی اس نیکی کے عیوض حاصل شدہ جنت بانٹوں تو بھی بچ جائے گی۔'' اور بعد از مرگ، اُس وقت کے قدامت پسند کلیسا نے اس فن کارہ کی آخری رسومات ادا کرنے

کے لیے چرچ کے دروازے کھولنے سے انکار کیا تھا تو اُسے ایک گڑھا کھود کر دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر کوئی کتبہ تک نہ لگا، لیکن آج وہ Performing Arts کی دنیا میں کسی سورما سے کم حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی صف میں چلی کا گلوکار اور سنگیت کار وکٹر ہارا بھی ہے، جس نے اپنے فن کو ۱۹۷۳ء میں جنرل پنوشے کے مارشل لا کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بنایا اور وہ باغی، جس کے لیے چلی کے منتخب صدر سلوا دور آلندے نے کہا تھا کہ ''میری فتح میں نوے فیصد حصّہ وکٹر ہارا کے گلے اور گٹار کو چھوتی انگلیوں کا ہے۔'' اسے تشدّد کر کے ہلاک کیا گیا لیکن وہ آج بھی اپنی سوانح عمری کے عنوان ''وکٹر ہارا کا امر گیت'' کے مصداق اس طرح زندہ ہے، جیسے سندھی کے پیارے شاعر نارائن شیام نے ان کے لیے ہی کہا ہو:

''ہمارے جسم راکھ بن کر منتشر ہوں گے ہواؤں میں
پر فضاؤں میں شیام، آواز میری تمہیں ڈھونڈے گی''

آوارہ گرد کی رائے میں گلوکاروں کے خلاف انسان دشمن گروہوں کی کارروائی ان کی طرف سے اپنے مشترکہ فن ودانش کے ورثہ پر ایک وار سمجھنا چاہیے، کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ سندھ میں ہندو مسلم فساد روز بہ روز بڑھتا جائے لیکن بھگت کنور رام ہر پروگرام سے ہونے والی آمدنی تقسیم کرتے ہوئے ہندو اور مسلمان کا امتیاز کیے بغیر فقط ضرورت مند انسان کو ہی دیکھتے تھے۔

ماضی قریب تک ''پیچنے'' اور ''سرندہ'' والے فقیر، گل ''ہندو۔ مسلمان'' کا خیر مانگتے ہوئے آوارہ گرد نے بھی دیکھے ہیں۔ پھر جب جنرل ضیا کے روپ میں سماج کو تقسیم کرنے کی کوشش ہوئی تو پھر ناہید صدیقی کے ''کلاسیکل نرت'' کو ''مجرا'' کہا گیا اور مہتاب راشدی کا سر زبردستی ڈھانپنے کی کوشش کی گئی تو زمانے نے دیکھا کہ دونوں آنکھوں کی جوتی سے محروم لڑکی سے زیادتی بھی ہوئی تو زانی کہہ کر کوڑے بھی اُسے ہی مارے گئے اور کراچی یونی ورسٹی کی طالبات پر تیزاب بھی پھینکا گیا۔

جنرل ضیا کے مسلّط کردہ انسان دشمن قوانین اب سماج میں اتنے گہرے پیوست ہو چکے ہیں کہ کچھ عرصہ قبل کراچی کی مقامی انتظامیہ نے وزیر اعلیٰ کے ایک مشیر کی ہدایت پر شیما کرمانی کو کلاسیکل نرت ''بھارت ناٹیم'' پیش کرنے سے روک دیا۔ اس مشیر نے کچھ مولویوں کے کہنے پر یہ فن دشمنی کی تھی۔ اب جنرل ضیا کے ذہنی مریدوں کو کون بتائے کہ یہ وہ دیس ہے جہاں

موھن جوڈرو میں مذہبی پیشوا جتنی اہمیت رقاصہ ''سمبارہ'' کو بھی حاصل تھی اور جہاں کا شاعر بلھے شاہ کہتا ہے: ''کنجری بنیاں میری عزت نہ گھٹدی، مینوں نچ کے یار مناون دے۔''

آوارہ گرد کبھی کبھار سوچتا ہے کہ جن لوگوں نے استاد بڑے غلام علی خاں کو اپنے پُرکھوں کا شہر چھوڑنے پر مجبور کیا اور جنہوں نے بھگت کنور رام کو خاموش کرانے کے لیے لوگوں کی بھڑکایا وہ اپنے کیے پر پشیماں بھی ہوتے ہوں گے؟

بس صاحب! ہر کوئی خواجہ خورشید انور بھی تو نہیں کہ جوانی کے دنوں میں بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ ہونے کا دکھ زندگی کے آخری پل تک جھیلتا رہے۔

☆......☆......☆

# درد کی میٹھی چبھن

کافی عرصہ ہوا آوارہ گرد نے ایک پوسٹر پر لکھا دیکھا تھا کہ "Where there is no love Put Love and your will find Love" بات ہے تو سادہ سی لیکن صاحب پریت یا عشق کے رنگ ہی کچھ اور ہیں۔ آج کل جناح اسپتال میں موت سے نبرد آزما سائیں جی ایم سیّد کو اُن کے پچھلے جنم دن پر جب ان کی ہی کتاب ''دیارِ دل داستانِ محبت'' سے کچھ اقتباسات سنائے گئے تو وہ اپنی جوانی کے عشق یاد کر کے رو پڑے۔ آوارہ گرد کی رائے میں یہ آنسو جی ایم سیّد کی آنکھوں سے نہیں بلکہ ایک عاشق کے اندر سے تمام حجابی بند توڑ کر نکلے تھے۔

عشق کی واردات ہی کچھ ایسی ہے کہ جس کے ساتھ ہو اس سے دنیا کا سارا سکون رخصت ہو جائے اور جواباً ملے ایسا کرب جو ہر کوئی اپنے ساتھ ہونے کی تمنا کرے!

آوارہ گرد نے کلاسیکی شاعری اگرچہ انتہائی کم پڑھی ہے تاہم وہ اتنی بات یقین سے کہہ سکتا ہے کہ عشق یونان سے لے کر فرات تک اور ٹیمز کے کنارے سے سندھو کنارے تک ہر شاعر ادیب تو کیا ہر خاص و عام کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ آوارہ گرد کا خیال ہے کہ دنیا کے ہر مصنف نے عشق پر لکھا ضرور ہے البتہ اِسے کچھ الفاظ میں واضح کرنے سے ہر ایک قاصر ہے۔

بلھے شاہ کہتے ہیں ''تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا'' تو بھٹائی اپنے محبوب کو پونم کے چاند سے زیادہ گنوا کر چاند کو محبوب کے پیر کے خم سے مشابہت دیتا ہے۔ ملک محمد جائسی کا کہنا ہے کہ

پریت کی آگ سے تو زمین و آسمان تک کانپتے ہیں یا پھر آفرین ہے اُن دلوں کو کہ جن میں یہ آگ سماتی ہے! بھگت کبیر کا کہنا ہے ''تال سوکھ کر پتھر بھیو، ہنس کہیں نہ جائے، یا پچھلی پریت کے کارن کنکر چن چن کھائے۔'' تو شیخ ایاز کہتا ہے ''عشق؟ پھول گائے یا بلبل سے خوشبو آئے۔''

عشق پنّھوں کے لیے سسی سے پہاڑ سر کراتا ہے تو برطانیہ کے جارج ہشتم سے تخت چھڑواتا ہے۔

یار! سچ پوچھو تو رنگی کا یہ رنگ (عشق) آوارہ گرد کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر حافظ شاعر ہونے کے ناطے محبوب کے رخسار کے تل پر ثمرقند و بخارا قربان کرے تو بات سمجھ میں آسکتی ہے لیکن لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم جاری کرنے والا سخت دل ہٹلر اپنی محبوبہ کے لیے تڑپے تو یہ بات کم از کم آوارہ گرد کی تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کوئی سمجھا سکے......

عشق پر یاد آیا کہ سولھویں یا سترہویں صدی میں بنگال کا ایک مرشد زادہ سید مرتضیٰ ایک شادی شدہ برہمن زادی آنندیوی پر عاشق ہوگیا۔ خاتون بھی سید مرتضیٰ کے زلف کی اسیر ہوگئی۔ سید مرتضیٰ اب خود کو مرتضیٰ آنندی کہلانے لگے۔ اس آنندی فرقے سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ اب بھی سیاسی بنیادوں پر تقسیم شدہ بنگال کے دونوں حصوں میں بستے ہیں۔ پھر لاہور کے شاہ حسین کو دیکھیں، ایک ہندو لڑکا ان کا محبوب بنا تو عشق کی گرمی نے نہ صرف شاعری کرائی بلکہ مادھو لال حسین نام بھی رکھوایا۔

آوارہ گرد کو امرتا پریتم کا ناول ''ناگ منی'' یاد آرہا ہے جس میں مرکزی کردار مصور کے لیے عورت بے نام و بے چہرہ بیسوا ہے لیکن جب اُسے اپنی ایک شاگرد کی محبت کی آگ لگتی ہے تو پھر سینکڑوں میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود سپنوں میں آنے والی پریتما ان ہی کپڑوں اور چوڑیوں میں نظر آتی ہے جو حقیقت میں اس نے پہنے ہوئے تھے۔

آوارہ گرد کو لیلیٰ اور قیس (مجنوں) کے قصے میں یہ بات کسی بھی طرح خیالی نہیں لگتی کہ جب قرآن پڑھانے والے اُستاد نے قیس کی پٹائی کی تو نیل لیلیٰ کی ہتھیلی پر نمودار ہوئے۔

آوارہ گرد کو پندرہ بیس سال قبل کراچی میں پڑھنے والے ایک فلسطینی طالب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جس کی پریتما ایک یہودی آبادکار کی بیٹی تھی جب کہ ہمارا یہ فلسطینی سورما یہودی

آباد کاروں کو کسی بھی قسم کی رعایت نہ دینے والی ایک تنظیم کا رکن تھا۔ بس تو صاحب! اس عاشق کا حال بھی فیض صاحب کے شعر'' وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے/ ذرا اک بار مرا محبوب نظر تو دیکھو'' جیسا تھا۔

سید مرتضیٰ، شاہ حسین، جی ایم سیّد اور فلسطینی یار کی راہ پر چلنے والے بوسنیائی عیسائی گھبرو اور مسلمان لڑکی بھی تو تھے۔ بس یار! اس کٹھور دنیا میں عشق کرنے والوں کو مشترکہ قبریں یا کارو کاری قرار دے کر گردن پر لگنے والی کلہاڑی یا بچھوڑے کے پل ہی نصیب ہوتے ہیں۔ پھر بھی لگتا ہے کہ آگ کا دریا میں قرۃ العین حیدر کی کہی ہوئی بات درست ہے کہ'' خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے محبت کی، پھر چاہے اس میں ناکام رہے۔''

ویسے تو کسی انڈین فلمی گانے کا مصرعہ بھی ہے کہ'' تن کا تن سے ملن ہو نہ پایا تو کیا، من کا من سے ملن کوئی کم تو نہیں۔'' لیکن آوارہ گرد کی خواہش ہے کہ کوئی بھی ایوب کرمانی کی طرح اپنے عشق میں ناکامی پر خودکشی نہیں کرے بلکہ ہر کوئی امروز کی طرح اپنی امرتا پائے۔ کوئی بھی سوہنی کی طرح بیچ منجدھار اپنا مہینوال نہ گنوائے بلکہ نصرت اصفہانی کی طرح اپنے زلفی سے ملے۔

آوارہ گرد کی بس اتنی سی خواہش ہے کہ دنیا کی تمام لغتوں سے'' بچھوڑے'' کا لفظ خارج کردیا جائے اور ہر اُس جان دار کو جو عشق کر سکے، دنیا کے باقی تمام کاموں سے رخصت دی جائے تا کہ کوئی فیض احمد فیض یہ نہ کہہ پائے:

''وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا''

☆......☆......☆

# پونا انسٹیٹیوٹ اور برسوں پرانی خواہش

کچھ دن ہوئے پنجاب کے شہر گوجرانوالہ میں ملاّؤں کے ایک ٹولے نے شہر میں ایک ناٹک منڈلی پر حملہ کر کے کچھ فن کاروں کو زخمی کر دیا۔ گوجرنوالہ پنجاب کے ماضی قریب میں صنعتی ترقّی کرنے والے شہروں میں سے ایک ہے۔ آوارہ گرد کو گوجرنوالہ پنجاب کے اُن اکادکاّ شہروں میں سے ایک نظر آیا ہے جہاں سماجی ترقی یا شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں نکاسی کا پانی تک جھیل بن کر پورے سال کھڑا رہتا ہے۔

ذکر چل رہا تھا زخمی فن کاروں کا، جن میں خیام سرحدی بھی شامل تھے۔ پاکستان ٹی وی کے لاجواب فن کار خیام سرحدی اپنے دور کے مشہور ترقی پسند فن کار اور فلم ساز ضیاء سرحدی کے بیٹے ہیں، تقسیم سے قبل ''ہم لوگ'' جیسی لازوال فلم بنانے والے۔ خیام سرحدی پاکستان میں فن دشمنی کی وجہ سے آج کل انگلستان میں رہائش پذیر ہیں۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں اور ذوالفقار علی بھٹو کے حکومتی ایام تک تو پاکستانی فلم اور ٹی وی نے کچھ جوہر دکھائے لیکن باقی تمام عرصہ یہ ادارے بھی جمہوریت کی طرح آمروں اور ملاؤں کی آمریت کے شکار رہے۔

آوارہ گرد کی رائے میں فن دشمنی محض ملاؤں نے نہیں دکھائی ہے بلکہ پاکستان کے لبرل سمجھے جانے والے حکمران بھی اس جرم میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ یہاں قرۃ العین حیدر اور اُستاد بڑے غلام علی خاں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو سعادت حسن منٹو کو پاگل خانے میں

داخل ہونے اور دیسی شراب کی بوتل کے عوض افسانے اور ناٹک لکھنے پر مجبور کیا گیا۔ آوارہ گرد کا خیال ہے کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک Performing Arts کے لیے سب سے بہتر دور بھٹو کی حاکمیت کے ابتدائی برس تھے جب ایک جانب پاکستان ٹی وی سے ،منٹو، چیخوف اور شوکت صدیقی جیسے ترقّی پسند مصنفین کی تحریروں پر ڈارمے وغیرہ پیش ہوئے تو دوسری جانب پاکستان آرٹس کونسل فیض احمد فیض کی سربراہی میں سرگرم رہی لیکن صاحب جنرل ضیا کا مارشل لا آتے ہی ''کسی کا دل نہ دکھانے'' کا عہد کیے ہوئے فیض صاحب خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے اور بعد ازاں انہوں نے خود ساختہ جلا وطنی بھی اختیار کرلی۔ جب کہ ٹی وی سے کچھ اہم افراد کو نکال دیا گیا۔ ٹی وی سے باقی ماندہ جھاڑو ۱۹۷۸ء میں ہونے والی ہڑتال کے بعد پھیری گئی، جب شاہد محمود ندیم اور طاہر رضوی سمیت اَن گنت ملازمین کو ملازمتوں سے برطرف کیا گیا۔ آوارہ گرد کو کسی نے بتایا تھا کہ اب پی ٹی وی پر ایک اہم سندھی شخصیت کو ٹی وی کی اس ہڑتال ختم کرانے پر نوازا گیا تھا۔

کلاسیکل رقص کی ملکہ ناہید صدیقی کو رقص کرنے پر اتنا معتوب گردانا گیا کہ وہ انگلستان میں جا کر بس گئیں۔ بس صاحب! برداشت نہ کرنے کی بات تھی کہ مہتاب چنہ (راشدی) کو سر پر دوپٹہ نہ ڈالنے پر ٹی وی اسکرین سے اُس جنرل ضیا نے ہٹوایا جس کی اپنی بیوی (شفیقہ) نے کبھی بھی اپنا سر نہیں ڈھانپا! بس پھر تو ٹی وی پر صرف تین چیزیں آنے لگیں، جنرل ضیا، مولوی اور اشفاق احمد کے ڈرامے!

ضیا دور میں آوارہ گرد کی معلومات کے مطابق ابتدائی مزاحمتی ناٹک شیما کرمانی اور خالد احمد کے گروپ ''تحریک نسواں'' نے پیش کیے، ۸۱۔۱۹۸۰ء میں اس گروپ نے ''تفتیش'' اور ''چادر اور چار دیواری'' جیسے کھیل پیش کیے تو سہمے اور ڈرے ہوئے لوگوں کے ساتھ ساتھ ظلم وجبر سے جنگ جوتنے والوں کو بھی ایک نیا حوصلہ ملا۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ ان ابتدائی کھیلوں میں انگلیوں پر گنے چنے لوگ ہی آتے تھے۔ پاکستان میں اسٹریٹ تھیٹر یا متبادل تھیٹر کی سرگرم ابتدا کراچی میں اسلم اظہر کے گروپ ''دستک'' اور لاہور میں مدیحہ گوہر کے گروپ ''اجوکا'' سے ہوئی۔

کراچی کے ایک ہال میں ہونے والا دستک گروپ کا پہلا اہم اسٹیج ڈرامہ ''گالیلیو کی داستان'' مسلسل تین دن تک جاری رہا۔ گالیلیو کی داستان جرمن مصنف اور متبادل تھیٹر کے بانی

برتولت بریخت کا لازوال ناٹک ہے۔ سندھی میں تو یہ کافی عرصہ قبل ابراہیم جویو صاحب نے ترجمہ کر کے شایع کیا تھا تاہم اردو جاننے والے اکثر دانش وروں کے لیے بھی یہ ایک بالکل نئی تخلیق تھی۔ سندھی زبان میں کئی تحریریں پاکستان کی دیگر زبانوں سے قبل شایع ہوتی رہی ہیں۔ اس وقت آوارہ گرد کو فیڈل کاسترو کے عدالتی بیان ''تاریخ مجھے بری الذمہ قرار دے گی'' کا ۷۲۔۱۹۷۱ء میں انور پیرزادہ کا کیا ہوا ترجمہ یاد آرہا ہے، یہ تقریر اردو میں ۸۶۔۱۹۸۵ء میں جاکر شایع ہوئی۔

بات چل رہی تھی دستک گروپ کے پیش کردہ ناٹک گالیلیو کی داستان کی۔ اس ناٹک نے مستقبل کے کئی نامور فن کار پیدا کیے جن میں منصور سعید، ثانیہ سعید، شاہد شفاعت اور دیگر شامل ہیں۔ دستک گروپ نے اُن دنوں یکے بعد دیگر کئی ایک ناٹک پیش کیے جن میں ''وہ جو کہتا ہے ہاں، وہ جو کہتا ہے نہیں'' ''مڈل کلاس'' قابل ذکر ہیں۔ اُن دنوں یکم مئی کو ایک مزدور بستی میں ہونے والا ایک ڈرامہ آوارہ گرد کو یاد آرہا ہے، جس میں ایک مرحلے پر جب جج ظالم کے حق میں مظلوم کے خلاف فیصلہ سنا رہا تھا تو ناظرین میں سے کسی نے پھبتی کسی کہ'' اوئے مولوی مشتاق!'' واضح رہے کہ لاہور ہائی کورٹ کی جس فل بینچ نے ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت سنائی تھی، اس کا چیف جسٹس مولوی مشتاق تھا۔ یہ اسٹریٹ ڈرامے اپنے ناظرین کو محض ناظرین رہنے نہیں دیتے تھے بلکہ اکثر ڈراموں کے دوران ناظرین میں سے کئی ایک تبصروں کے ذریعے اپنی شرکت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ذکر بالا ڈرامے کے دوران جب ایک منظر میں ایک سیٹھ کسی مزدور کو لاٹھی سے پیٹتا ہے تو ہال سے یہ بھی آواز آئی تھی کہ'' مت مارو!''

آوارہ گرد نے لاطینی امریکی ملک پیرو کے ایک اسٹیج ڈائریکٹر کا ایک مضمون پڑھا تھا جس میں عوامی تھیٹر پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا گروپ ایک دور دراز علاقے میں کوئلے کی کان کے سامنے ڈرامہ کرنے گیا، جس کے لیے مزدوروں کو کہا گیا کہ وہ اپنے ساتھ لالٹین ضرور لائیں تاکہ روشنی کا بندوبست ہوسکے۔ اس ڈائریکٹر کے بہ قول جب کوئی منظر مزدوروں کو پسند نہیں آتا تو وہ آپس میں گپ شپ شروع کر دیتے تھے اور اس سے لالٹین کا رخ اسٹیج سے ہٹ جاتا تھا اور ناٹک منڈلی کو یہ احساس ہوجاتا کہ کون سا پیغام اپنے حاضرین اور ناظرین تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے۔

سواسّی کی دہائی کے ابتدائی نصف کے دوران پاکستان نے بھی متبادل تھیٹر کی بنیاد اور

عروج دیکھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۳ء کی جمہوریت کی تحریک کے بعد کراچی سنٹرل جیل میں بھی ایک سیاسی اسٹیج ڈرامہ پیش کیا گیا۔ انہی دنوں بیدل مسرور اور شاہد بھٹو نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ''وائسنز'' نامی ایک گروپ تشکیل دیا، جس نے موسیقی کی دنیا میں کچھ نئے تجربات بھی کیے لیکن بدقسمتی سے دستک اور وائسنز گروپ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی توڑ پھوڑ کا شکار ہوگئے اور دستک گروپ کے دوستوں نے کئی الگ الگ گروپ بنا دیے۔ اس دوران لاہور میں مدیحہ گوہر اور ان کے ساتھیوں نے اجوکا گروپ کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ اجوکا گروپ اپنے سینئر ہم عصر دستک گروپ کے مقابلے میں زیادہ سیاسی ناٹک پیش کرنے لگا۔ اجوکا پنجابی زبان میں بھی ڈرامے کرنے لگا۔

یہاں یہ ذکر بھی کردیا جائے کہ کراچی میں پیش ہونے والے لگ بھگ تمام ڈرامے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی مالی امداد سے ہوتے رہے۔ اس دوران جنرل ضیا کی موت اور اس کے بعد بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت نے ٹی وی پر اسلم اظہر، طاہر رضوی، شاہد محمود ندیم کی دوبارہ انٹری کرائی جب کہ ضیا مارشل لا میں اسٹریٹ تھیٹر کے ذریعے ابھرنے والے کئی ایک فن کار ٹی وی پر آئے۔ بے نظیر کے اٹھارہ ماہ کے دوران ٹی وی پر پیش ہونے والی اہم ترین سیریل لاہور سینٹر سے شاہد محمود ندیم کی ''نیلے ہاتھ'' اور کراچی سینٹر سے نورالہدیٰ شاہ کی ''تپش'' تھیں۔ نواز شریف اور اس سے قبل غلام مصطفیٰ جتوئی کی حکومتوں نے پاکستان ٹیلی وژن کو ایک مرتبہ پھر اظہر لودھی جیسے لوگوں کے حوالے کردیا......

اسی دوران آوارہ گرد نے لاہور میں نوجوانوں کے ایک گروپ ''لوک رہس'' کی جانب سے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں پیش ہونے والا ڈرامہ ''کُتے'' دیکھا۔ ایک بھارتی مصنف کے تحریر کردہ اس ڈرامے کو لاہوری دوستوں نے پاکستان کے حالات سے مکمل طور پر جوڑ دیا تھا۔ اس دوران ملک میں بڑھنے والی مذہبی اور لسانی خلیج پر بھی کئی ایک ڈرامے پیش ہوئے۔ لاہور کے اجوکا گروپ نے مذہبی امتیاز اور عورتوں سے ہونے والی زیادتیوں پر کامیاب ڈرامے پیش کیے تو تحریکِ نسواں نے مذہبی روا داری پر ''جنھیں لہور نہیں ویکھیا'' اور کراچی کی صورتحال پر ''یہاں سے شہر کو دیکھو'' جیسے ڈرامے پیش کیے۔ ان دونوں ڈراموں بالخصوص ''جنھیں لہور......'' نے جس میں موقع کی مناسبت سے ناصر کاظمی کی شاعری بھی شامل کی گئی تھی، دیکھنے اور سننے والوں سے ٹھنڈی آہیں بھروادی تھیں۔

آوارہ گرد کی رائے میں پاکستان میں ڈراموں اور بالخصوص اسٹریٹ یا عوامی تھیٹر کے مضبوط نہ ہونے کا سبب حکومتی زیادتی یا نظرانداز ی سے زیادہ ناٹک منڈلیوں کی جانب سے اکثر غیر ملکی ڈارمے پیش کرنا ہے۔ آوارہ گرد کو یاد آیا کہ اسلام آباد میں منعقدہ پاکستان ناٹک فیسٹول میں سندھی ڈرامے ''دو دو سومرو کی موت'' کی ہال میں موجود تمام لوگوں نے کھڑے ہوکر تالیاں بجا کر پذیرائی کی تھی۔ اس فیسٹول میں مقامی حالات سے میل کھانے والے ڈراموں کو تو داد ملی لیکن جو ڈرامے بیرون ممالک بالخصوص یورپی ڈراموں سے اخذ کیے گئے تھے، خاص داد حاصل نہیں کر سکے تھے۔

آوارہ گرد کی خواہش ہے کہ اس ملک میں بھی ''پونا انسٹی ٹیوٹ آف پرفارمنگ آرٹس'' جیسا کوئی ادارہ قائم ہو تا کہ وہ بھی اسٹیج ڈائریکشن کی تربیت حاصل کر کے اپنی برسوں پرانی خواہش پوری کر سکے۔

☆......☆......☆

# گا نہیں سکتے تو کیا ہوا......

پچھلے ہفتے سندھی ادبی سنگت لیاری کی جانب سے اکتوبر ۱۹۹۴ء میں بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں ہونے والی ایک تقریب میں برصغیر کی صوفی شاعری کی نشست کی ویڈیو دکھانے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ پروگرام ''صفدر علی ہاشمی میموریل آرٹسٹ ٹرسٹ'' (SAHMAT) کے فیسٹول ''فرقہ واریت کے خلاف فن کار'' (Artists Against Communalism) کا ایک حصہ تھا۔

ابتدا کی جائے SAHMAT کے ذکر سے۔ یہ گروپ صفدر ہاشمی کے نام پر قائم کیا گیا ہے۔ نئی دہلی میں ایک اسٹریٹ تھیٹر گروپ کے ڈائریکٹر اور اداکار صفدر ہاشمی کو کچھ سال قبل حکمران کانگریس پارٹی کے کچھ مسلح کارکنوں نے خنجر کے وار کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ سیاسی اور نظریاتی طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستہ صفدر ہاشمی اگرچہ کلاسیکی تھیٹر میں اہم نام نہیں تھے لیکن ان کی ہلاکت کے بعد ان کے ساتھیوں نے صفدر کے نام پر SAHMAT قائم کر کے ان کے نقطۂ نظر کو آگے بڑھاتے ہوئے فرقہ واریت کے خلاف کسی حد تک آواز ضرور بلند کی ہے۔

اسّی کی دہائی کے دوران جب آوارہ گرد کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے طلبہ محاذ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا رکن تھا تو ''کامریڈ'' صفدر ہاشمی پاکستان آئے تھے۔ آوارہ گرد اور اس کے کئی ایک دوستوں کو وہ کسی دانش ور فن کار کے بجائے پارٹی مشینری کا ایک پرزہ لگے تھے بہ ہر صورت اُن دنوں نظریاتی Commitment ہی سب کچھ سمجھی جاتی تھی۔ صفدر سے

ایک دو ملاقاتوں کے دوران جو گپ شپ ہوئی، وہ اب گڑے مردے کھودنے والی بات ہوگی۔ خواہ مخواہ دھول اڑائی جائے! سو بات کوئی دوسری کی جائے۔ SAHMAT کے اس فیسٹول میں کلاسیکل نرت، تھیٹر (ناٹک) اور موسیقی کے علیحدہ پروگرام ہوتے تھے۔ فقط موسیقی کا پروگرام ہی دو تین گھنٹوں کی تین وڈیو کیسٹ پر ریکارڈ شدہ تھا۔ بہ ہر حال ادبی سنگت لیاری نے موسیقی کی تین کیسٹوں کا جوہر نکال کر بنائی جانے والی ایک وڈیو کیسٹ پیش کی، جس کا ابتدائی حصہ بھگت کبیر اور امیر خسروؒ کی شاعری پر اور دوسرا حصہ سندھ اور پنجاب کی صوفی شاعری پر جب کہ تیسرا حصہ برصغیر کی دیگر زبانوں کی شاعری پر مشتمل تھا۔

اگرچہ کیسٹ کا تعارف کراتے ہوئے چندر کسیوانی نے یہ بحث طلب بات کہی کہ آج کا انسان کوئی آدرش نہ ہونے کی وجہ سے ''روحانی بحران'' کا شکار ہے، اس لیے شیعہ اور سنّی بن کر ایک دوسرے کو ہلاک بھی کرتا ہے تو ایک دوسرے کو بچانے کے لیے بم لگی امام بارگاہ اور گولیوں سے چھلنی مسجد سے زخمیوں اور ہلاک شدگان کو ایدھی ایمبولینس میں بھی ڈالتا ہے۔ بابری مسجد بھی گراتا ہے تو مہاتما گاندھی کو باپو بھی کہتا ہے اور ''ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا، انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا'' جیسا گانا سن کر رو بھی پڑتا ہے۔ ایل کے ایڈوانی بن کر ہندو انتہا پسند جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی کی بنیاد رکھتا ہے تو بچپن یا جوانی کے مسلمان دوستوں کو یاد کر کے جذباتی بھی ہوتا ہے۔

سو، بات چل رہی تھی صوفی راگ کی! آوارہ گرد کو اگرچہ کیسٹ کے تیسرے حصّے میں شامل زبانیں سمجھ میں نہیں آئیں لیکن ایک عرصے کے بعد ایسے راگ اور موسیقی سننے کا موقعہ ملا کہ دل بھر آیا۔ سندھ سے اس فیسٹول میں شریک ہونے والے علن فقیر کے علاوہ کیسٹ میں شامل تمام فن کاروں نے فیسٹول کے عنوان ''فرقہ واریت کے خلاف فن کار'' سے نہ صرف انصاف کیا بلکہ اپنے فن کو اس بلندی پر لے گئے کہ سننے والے مدہوش ہوگئے۔ مدہوش ہونے کی بات خواہ مخواہ دانش ورانہ الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اتنا پر اثر تھا کہ آوارہ گرد سمیت کئی ایک سگریٹ نوشی کرنے والوں کو سگریٹ سلگانا بھی یاد نہیں رہا۔ آوارہ گرد کو بھگت کبیر اور امیر خسروؒ کی شاعری والے حصے نے سب سے زیادہ متاثر کیا، بالخصوص شوبھا گرو نے اونچے سروں میں امیر خسرو کو گا کر ایک نیا رنگ پیدا کر دیا اور جب پنڈت جسراج نے بھگت کبیر کو گاتے ہوئے ''حضرت محمدؐ'' کہا تو آوارہ گرد کو محسوس ہوا کہ جیسے کسی گانے والے نے پہلی

مرتبہ ''محمدؐ'' نام کا حق ادا کیا ہو، ورنہ ہمارے ہاں رمضان اور محرّم کے مہینوں میں پیسے کمانے کے لیے اتنے نام نہاد فن کار یا نوحہ خواں پیدا ہو جاتے ہیں کہ خدا کی پناہ!

جن فن کاروں نے آوارہ گرد کو متاثر کیا اُن میں شوبھا گرو اور پنڈت جسراج کے علاوہ کنکنا بنرجی، استاد صغیر حسین اور دیگر شامل تھے۔ یہ کیسٹ دیکھتے ہوئے آوارہ گرد پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ زندگی میں ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکی ہے۔ کچھ سال قبل آوارہ گرد فیصل آباد میں اُستاد نصرت فتح علی خاں کے والد کی برسی کے موقعہ پر ہونے والی محفل موسیقی میں موجود تھا۔ اس برسی کا بھی اپنا رنگ ڈھنگ تھا۔ اس میں پہلے دن صرف قوالی ہوتی ہے۔ دوسرے دن نئے اور اُبھرتے ہوئے فن کار گاتے ہیں، یہ ابھرتے ہوئے فنکار بھی اپنے فن میں یکتا ہوتے ہیں۔ برسی کے تیسرے دن اساتذہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ صاحب! اُس رات بھی ''اللہ دے بندہ لے'' کی سی صورت حال تھی! اساتذہ نے یکے بعد دیگرے گا کر وہ شام غریباں پیدا کی کہ سننے والے اپنے حواسوں میں نہیں رہے! آوارہ گرد نے اُس رات طے کیا تھا کہ اگر خود گا نہیں سکتے تو کیا ہوا، ایسی محفلوں میں سننا تو ممکن ہے اس لیے اب اس برسی میں ہر صورت میں شرکت کی جائے گی لیکن شومئی قسمت کے اُس کہ بعد پھر اس تقریب میں شرکت کا موقعہ تا حال نصیب نہیں ہوا۔

بس صاحب! سنگیت چیز ہی ایسی ہے کہ موزارٹ سے یہ خواہش کراتی ہے کہ ''کوئی ایسی دُھن بجاؤں کہ لانڈری میں پڑے ہوئے میلے کپڑے دُھل جائیں'' تو تان سین سے پانی میں آگ لگواتی ہے!

آوارہ گرد کو ۱۹۸۹ء میں لاہور میں منعقدہ فیض امن میلہ یاد آ رہا ہے، جس میں عابدہ پروین ''گھوم چرخڑا سائیاں دا، تیڈی کتن والی جیوے'' گانے کے دوران جب ''گھوم چرخڑا......'' کہتی تھیں تو اوپن ایئر ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ تو کیا اردگرد کی ہر جان دار اور بے جان چیز میں جان پڑتی محسوس ہو رہی تھی اور وہ بھی چرخے کی طرح حرکت میں آنے لگتی تھی۔ اسی پروگرام میں جب اقبال بانو نے فیض کی نظم ''ہم دیکھیں گے، وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے......'' میں ''جب مظلوموں کے پاؤں تلے یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی'' مصرعہ گا رہی تھیں تو واقعی دھرتی دھڑکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ عابدہ پروین کے ذکر پر یاد آیا کہ جب وہ ٹی وی پر ایک کلام کے دوران ''اللہ ہو'' کا نعرہ لگا رہی تھیں تو آوارہ گرد کے برابر میں بیٹھا ہوا دیوار برلن

گرنے کے بعد بھی کمیونسٹ رہنے والا ایک یار عابدہ کے ساتھ اللہ ہو کا نعرہ لگا رہا تھا۔ وہ یہ نعرہ اللہ کو گڑگڑاتے ہوئے نہیں بلکہ عابدہ پروین کے گانے کے ٹرانس میں آ کر لگا رہا تھا! اور ہاں، درمیانے طبقے سے ابھرنے والی ایک مصورہ نے ایک دن بالائی طبقے کی منافقیوں پر غصّے میں آ کر جب یہ کہا کہ وہ (بالائی طبقے والے) دن کو کارخانوں، فیکٹریوں میں لوگوں کا خون چوس کر نفع کماتے ہیں اور رات کو اقبال بانو سے فیض کا کلام سن کر ''اب راج کرے گی خلق خدا'' پر جھومتے ہیں تو آوارہ گرد نے اُسے اتنا ضرور کہا تھا کہ اس میں سرمایہ داروں کی منافقت کے ساتھ ساتھ اقبال بانو کا کمال بھی ہے جو اُن سے ان کی موت کا پیغام لانے والی بات بھی فن سے کرنے پر تعریف کراتی ہے!

بس صاحب! سنگیت کی دیوی (ہندو دیو مالا کے مطابق سرسوتی دیوی) اگر کسی پر مہربان ہو تو پھر لتا منگیشکر تخلیق ہوتی ہے کہ تیس سال قبل مغل اعظم فلم کے لیے گائے ہوئے ان کے گیت ''جب پیار کیا تو ڈرنا کیا'' اور پچھلے دنوں ریلیز ہونے والی فلم میں گائے ہوئے ان کے گیت میں آواز کی تازگی میں کوئی فرق نہیں!

بس یار! آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ یہ دنیا گانے والوں اور سنگیت کاروں کے حوالے کر دی جائے کہ انسان کے من کے کرب ختم ہوں تا کہ پریشانیوں سے آزاد دنیا میں سکھ کی سانس لینے کا موقعہ مل سکے!

☆......☆......☆

# فلمی پوسٹر، تانگے اور دوڑتے بچّے

کچھ عرصہ ہوا آوارہ گرد نے ایک سینما میں طویل عرصے کے بعد ایک اردو فلم میں عورتوں کی بڑی تعداد دیکھی۔ کئی برسوں سے پاکستان میں بننے والی غیر معیاری فلموں، وی سی آر اور ڈش انٹینا کی وجہ سے لوگوں نے سینما گھروں میں فلمیں دیکھنا ہی چھوڑ دی ہیں۔

آوارہ گرد اپنے بچپن سے سینما گھروں میں فلمیں دیکھنے کا کریزی رہا ہے، سو وقت بہ وقت اپنی ٹھرک مٹانے کے لیے سینما گھر کا رخ کرتا رہتا ہے۔ پچھلے کئی برسوں کے دوران آوارہ گرد کو سینما گھروں میں اتنی ویرانی نظر آئی ہے کہ رش میں ٹکٹ لینے اور ہاؤس فل کا بورڈ دیکھ کر چہرہ لٹکا کر واپس آنے والی کیفیت ہی ذہن سے مٹنے لگی تھی تاہم کچھ برسوں کے دوران کچھ فلموں بالخصوص اردو فلموں ''گناہ'' اور ''جیوا'' اور انگریزی فلموں ''کلف ہینگر'' ''جراسک پارک'' ''انڈیسنٹ پروپوزل'' اور ''دی گھوسٹ'' نے سینما کے شائقین کو دوبارہ سینما گھروں کی جانب متوجہ کر دیا ہے۔

بس یار! سینما گھروں کے بھی دن تھے! آوارہ گرد کو اپنا بچپن واضح طور پر یاد ہے کہ کئی دن پہلے گھر میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنتا تھا، پھر حیدر آباد میں تانگے پر اور کراچی میں بگھی پر سوار ہو کر فلم دیکھنے جایا جاتا تھا۔ اُن دنوں پورے کا پورا خاندان فلم دیکھنے جاتا تھا تو ٹکٹ بھی دس پندرہ لیے جاتے تھے۔ قومی ترانے کے بعد فلم شروع ہوتی تھی تو ابتدائی آدھا پون گھنٹہ کچھ

دل کش نغمے یا نذر، رنگیلا، منور ظریف اور نرالا کے مزاحیہ ڈائیلاگ چلتے تھے۔ اُن دنوں بھی (بچپن میں) عورتوں کے دبے دبے قہقہے کانوں کو اچھے لگتے تھے اور پھر منظر بدلتا تھا تو زیبا، شمیم آرا یا نیلو کے ٹریجک مکالمے اور سین اسکرین پر ہوتے تھے اور ہال میں ہوتی تھیں سسکیاں۔ بس پھر آخری منظر میں ہیرو اور ہیروئن آپس میں مل جاتے تھے اور دیکھنے والے یا والیاں آنسوؤں سے تر رومال اور سُرخ آنکھوں کے ساتھ واپس لوٹتے تھے۔ پھر کئی دنوں تک اس فلم کے ہر ایک منظر پر ہر کوئی اپنے طور پہ تبصرہ کرتا رہتا تھا۔

آوارہ گرد نے اپنی زندگی کی ابتدائی فلمیں حیدر آباد کے سینما گھروں اور سلاوٹ محلے میں کسی شادی بیاہ کی تقریب میں راستے کے بیچوں بیچ لگائے ہوئے پردہ پر دیکھی ہیں۔ حیدر آباد کے سلاوٹ محلّے کے رنگ ہی اپنے تھے یا ہیں۔ سلاوٹ بنیادی طور پر جیسلمیر کے علاقے سے سوڈیڑھ سو سال قبل نقل مکانی کر کے سندھ آنے والی برادری ہے، جن کی اپنی رسومات آج تک قائم ہیں۔ حیدر آباد کے سلاوٹ محلے اور خود سلاوٹ برادری پر کسی وقت تفصیل سے لکھا جائے گا، فی الحال بات کی جائے وہاں سڑک پر چلنے والی فلموں کی۔ اُن دنوں سلاوٹ برادری کے کئی افراد شہر کے مختلف سینما گھروں میں کام کرتے تھے اور ان کے ہاں اکثر تقاریب میں فلم ضرور دکھائی جاتی تھی۔ سلاوٹ محلے کے بیچوں بیچ گزرنے والے پرنس علی روڈ پر پردہ لگتا تھا اور اسکرین کے ایک طرف مرد بیٹھتے تھے تو دوسری طرف عورتیں۔ ان فلم شوز کے دوران ایک دلچسپ واردات یہ بھی ہوتی تھی کہ جب ہیرو، ہیروئن آپس میں ملتے تھے یا اسلم پرویز جیسے کسی ولن کو مار پڑتی تھی تو سلاوٹ برادری کے خواتین اور مرد اپنے ثقافتی اظہار کے طور پر تانبے کی کسی تھالی کو بیلن وغیرہ سے بجاتے تھے۔ یہ سازینہ آوارہ گرد نے آج تک بے سرا نہیں سنا۔

بچپن میں آوارہ گرد کے فلم کے حوالے سے کئی ایک دلچسپ تجربات ہیں۔ ایک مرتبہ جب آوارہ گرد کو اس کے کسی رشتہ دار نے کہا کہ وہ اپنے ماموں سے کہے کہ وہ اُسے فلم دکھائے اور جب آوارہ گرد نے ماموں سے ضد کی تو وہ حیدر آباد کی ایلیٹ سینما کے باہر لگے ہوئے پوسٹر یہ کہہ کر دکھا آیا کہ ''یہ ہے فلم!'' جونیئر آوارہ گرد کچھ دنوں تک تو غرور سے پُر تھا کہ وہ فلم بھی دیکھ آیا ہے تاہم پتہ تب لگا جب فلم دیکھنے کے لیے بھڑکانے والے رشتہ دار نے یہ پوچھا کہ ''فلم میں عورتیں بول کیا رہی تھیں'' تو آوارہ گرد نے پوسٹروں کو ہی اصل فلم سمجھ کر ایک دم جواب دیا کہ ''وہ تو جھوٹ موٹ کی عورتیں تھیں، وہ بولیں گی کیسے!'' سو اس رشتہ دار کی بات سے یہ پتہ

لگ گیا کہ آوارہ گرد کے ساتھ دھوکا ہوا ہے سو ضد کر کے اُسی ماموں کے ساتھ ایک بار پھر سینما گھر کا رخ کیا گیا۔

آوارہ گرد کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی زندگی کی پہلی فلم سندھی ''بادل'' تھی لیکن اس میں جب ڈاکوؤں کے گھوڑے دوڑنا شروع ہوئے تو آوارہ گرد نے ڈر کے مارے ماموں کو گھر واپس چلنے کو کہا اور پھر کئی دنوں تک اُن میٹرک کے طالب علم ماموں کا موڈ خراب رہا کہ آوارہ گرد کے ڈر کی وجہ سے وہ بھی فلم نہیں دیکھ پایا تھا۔

بس صاحب! پھر جو فلم دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ابھی تک جاری ہے۔ آوارہ گرد نے فلمی ستاروں کے کئی ایک عاشق بھی دیکھے ہیں ان میں ہر طبقے، عمر اور مکتبۂ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ آوارہ گرد کا ایک سیاسی کارکن اور صحافی دوست پاکستانی فلمی ہیرو ندیم کا عاشق ہے۔ وہ ندیم کی ہر فلم دیکھتا ہے۔ ایک مرتبہ حیدر آباد کے نیاز اسٹیڈیم میں اداکار غلام محی الدین کی قیادت میں فلم اسٹار الیون کسی عطیاتی مہم کے سلسلے میں حیدر آباد الیون کے ساتھ کرکٹ میچ کھیلنے آئی۔ فلم اسٹار الیون میں ہمارے یار کا ہیرو ندیم بھی تھا، سو اُس نے اعلان کیا کہ وہ ندیم سے ہاتھ ضرور ملائے گا۔ اس میچ کے دوران پولیس میدان میں آنے والے ہر تماشائی کو زدوکوب کر رہی تھی لیکن صاحب عاشق کہاں رُکتے ہیں۔ ہمارا یار بھی موقعہ ملتے ہی میدان میں کود پڑا۔ پھر تو صاحب بیس پچیس پولیس والے لاٹھیاں تان کر اس کے تعاقب میں تھے لیکن اس یار نے بریک جا کر ماری ندیم کے پاس۔ ندیم سے ہاتھ ملا کر، واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھا۔

آوارہ گرد نے کئی سال قبل اخبار میں پڑھا تھا کہ پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک نائی نور جہاں کا عاشق تھا اور اُس نے اپنی پوری دکان نور جہاں کی تصویروں سے سجا کر رکھی تھی۔ کسی نے جب اُس سے پوچھا کہ اُس نے یہ تصویریں کیوں لگائی ہیں تو اُس یار نے جواب دیا کہ نور جہاں ''جگر'' ہے (پنجاب میں جگر لفظ کسی انتہائی پیارے اور قریبی شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے) اُس پر بندے نے پوچھا کہ اچھا نور جہاں کے نام پر اپنا آدھا کلو گوشت دو گے۔ یہ سنتے ہی نائی نے استرا اپنی ران پر مارا اور اپنا گوشت چیر دیا! بس صاحب یہ ''جگر'' لوگوں کے جگر ہیں!

آوارہ گرد کو اپنی آوارہ گردی کے دوران فلموں اور سینما گھروں سے متعلق ہر جگہ تقریباً ایک جیسی باتیں نظر آئی ہیں یا سُننے کو ملی ہیں۔ سندھ اور پنجاب کے چھوٹے شہروں اور بڑی

دیہاتوں میں اکثر سینما گھروں کی چھتیں نہیں ہوتیں۔ آوارہ گرد بھی ایک مرتبہ ٹنڈو باگو کے بغیر چھت والے سینما میں فلم دیکھ چکا ہے۔ ٹنڈو باگو سے لے کر پنجاب کے کسی دور دراز کے گاؤں کے بغیر چھت کے سینما گھروں کے باہر اکثر ٹریکٹر ٹرالیوں پر سوار لوگ مفت میں وہاں Drive-In سینما گھروں کے مزے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے سوا ایک اور بات آوارہ گرد نے حیدرآباد، کراچی اور لاہور میں یہ سُنی ہے کہ جب دلیپ کمار کی فلم ''آن'' سینما گھروں میں لگی تو لوگ ٹکٹ لینے کے لیے بستر وغیرہ سمیت سینما گھروں پر قطاریں لگا کر سوئے بھی تھے۔

آوارہ گرد کو کسی نے بتایا کہ حیدرآباد کے نیو میجسٹک سینما میں ایک فلم کے دوران جب بین یا مُرلی بجی تھی تو سینما کی دیوار پر سانپ جھولنے لگا تھا۔ بس صاحب وہ بھی دن تھے۔ آوارہ گرد کو بھی ایسی کئی ایک فلمیں یاد ہیں جن میں جب ڈانس ہوتا تھا تو تماش بین میں سے کوئی ایک آدھ جذباتی ہو کر اسکرین کے آگے ڈانس کرنے لگتا تھا۔ فلم میں دھمال ہوتی تھی تو پورا ہال دھمال کرنے میں جٹ جاتا تھا۔ فلم کا کوئی منظر اچھا لگنے پر اسکرین کی جانب پیسے (سکے) پھینکنا بھی معمول تھا۔ یہ پیسے اکثر تھرڈ کلاس میں بیٹھنے والے لوٹتے تھے۔ اُن دنوں بھی فلم کے دوران ہوٹنگ اور نعرے ہوتے تھے لیکن ان میں بدتمیزی یا اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ اُن دنوں حیدرآباد اور کراچی کے ان سینما گھروں میں جہاں اردو رومانوی فلمیں لگتی تھیں کئی نوجوان ہیرو کٹ بال کٹوا کر، حیدرآباد میں کشیدہ کاری والے کرتے اور کراچی میں بیل باٹم سوٹ پہن کر ٹھنڈی آہیں بھرتے نظر آتے تھے۔

اُن دنوں فلموں کی پبلسٹی کا انداز بھی نرالا ہوتا تھا۔ حیدرآباد اور کراچی میں تانگے کے دونوں جانب فلم کے قد آدم پوسٹر لگا کر، ایک شخص فلم کا اعلان کرتا جاتا تھا۔ اعلان کرنے والا یہ شخص اکثر ایسا فن کار ہوتا تھا جو ''چانس'' (اداکاری کے شوقین افراد کی ایک مخصوص اصطلاح) ملنے سے محروم ہوتا اور وہ اپنے اندر کا جوار بھاٹا لاؤڈ اسپیکر پر ''چوری میرا پیشہ، نماز میرا فرض ہے'' جیسے ڈائلاگ بول کر ٹھنڈا کرتا تھا۔ پبلسٹی کرنے والے ان تانگوں سے فلمی پوسٹر اور پمفلٹ بھی تقسیم کیے جاتے تھے، جو آوارہ گرد جیسے بچے بھاگ بھاگ کر لیتے تھے۔ جبکہ چھوٹے شہروں اور گاؤں دیہات میں فلموں کی پبلسٹی کے لیے ڈھول بجا کر منادی کی جاتی تھی، اب تو روز بہ روز سینما گھر گرا کر ان کی جگہ پر پلازہ اور کارخانے بنانے کا رجحان چل پڑا ہے۔

آوارہ گرد کی رائے ہے کہ کسی معاشرے کے ذہنی دیوالیہ پن کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ

اُس کے سنیما گھروں کی جگہ پر شاپنگ پلازہ اور لائبریریوں اور کتب خانوں کی جگہ پر آٹے اور چاول کی دکانیں بنیں۔ آوارہ گرد کی بس اتنی سی خواہش ہے کہ جس طرح کراچی کے نشیمن سنیما اس کے نئے مالک نے نئے سرے سے شروع کیا ہے اُسی طرح حیدر آباد کے کیپٹیل، وینس اور ہل ٹاپ اور کراچی کے پیلس، پلازہ اور تاج محل سنیماؤں کو بھی کوئی نئے سرے سے آباد کرے تاکہ آوارہ گرد کی ہیروکٹ بالوں کے ساتھ ٹھنڈی آہیں نہ بھر سکنے والا کوٹا اُس کا چھوٹا بھائی پورا کرے۔

☆......☆......☆

# بے عقل دنیا کے عقل مند بچّے

حال ہی میں امریکی شہر نیوہیون میں اسپیشل اولمپک مقابلے اختتام کو پہنچے۔ امریکی صدر بل کلنٹن کے ہاتھوں جولائی کا آغاز میں افتتاح کیے گئے اس اولمپک میں دنیا کے ۱۴۶ ممالک سے تعلق رکھنے والے سات ہزار سے زیادہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بچوں نے شرکت کی۔ اس میزبان شہر نے اپنے نام (ہیون کا مطلب تھکاوٹ اتارنا یا آرام کرنا بھی ہے) کی لاج رکھتے ہوئے دنیا کے ان نظر انداز کیے ہوئے بچوں کو آزاد، جوش اور فتح کے جذبات سے پر فضا میں سانس لینے کا موقعہ فراہم کیا۔

۱۹۶۳ء میں ایونائس کینیڈی شراوَر کی جانب سے ذہنی طور پر معذور بچوں کے لیے شروع کی ہوئی گرما کیمپ اب اولمپک کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ان اولمپکس کی افتتاحی تقریب میں امریکی صدر بل کلنٹن نے کہا کہ میرے سامنے دنیا کے بہترین بچّے کھڑے ہیں اور اولمپکس کے بانی ایونائس نے خیر مقدمی تقریر میں کہا ''آپ میں سے ہر ایک اپنے ملک کا سفیر ہے اور کوئی بھی ملک آپ لوگوں سے بہتر سفیر نہیں بھیج سکتا۔''

کھیلوں کے دیگر مقابلوں کی طرح اس اولمپکس میں بھی کچھ کھلاڑیوں نے سونے، چاندی اور کانسی کے تمغے حاصل کیے جب کہ کچھ بچّے مقابلے جیت نہ پائے۔ اگر چہ ان اولمپکس کو

کھیلوں کے دیگر مقابلوں کی نسبت ابلاغ کے تمام ذرائع نے تقریباً کوئی جگہ نہ دی، اپنی برادری کے اس خودغرض رویے پر آوارہ گرد دنیا کے ان خاص بچوّں سے معافی کا طلبگار ہے کہ ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والے افراد بھی مادّی اشیا وسہولیات کے لیے سرگرداں اس کٹھور دنیا کا حصہ ہیں تاہم ان مقابلوں کے دوران پتھر دل پانی کرنے کے کئی ایک واقعات پیش آئے۔

ان مقابلوں کے دوران دو بچے اپنی زندگی گنوا بیٹھے۔ ان میں سے ایک تو رضا کاروں سے نظر بچا کر سمندر کے سینے پر ایسے چلا گیا جیسے بے انت سمندر کی ظالم لہروں کے بجائے کسی شفیق پری کے بالوں سے کھیل رہا تھا کہ اس اجنبی گود سے نکلنے کو مدد کے لیے پکارنے کے بجائے اس میں گہری نیند سو گیا۔

ان اولمپکس میں حصہ لینے والی ایدھی سینٹر میں پلنے والی ایک لڑکی نے نہ صرف چاندی کا تمغہ حاصل کیا بلکہ حیرت انگیز طور پر اس نے کھیلوں کے بعد ہونے والی تقاریب میں زیورات پہننا اور میک اپ کرنا بھی شروع کیا۔ پاکستان سے ہی تعلق رکھنے والا ایک لڑکا نہ صرف دو گھنٹے تک ایک امریکی لڑکی کے ساتھ رقص کرتا رہا بلکہ وہاں موجود ہر ایک سے اس طرح گپ شپ کرتا رہا جیسے برسوں سے ان کا واقف اور دوست ہو۔ اس دوران کسی کو پتہ ہی نہ لگا کہ وہ دونوں کانوں سے بہرا ہے!

اسی طرح اسپیشل اولمپکس میں ایک کھلاڑی بچہ دو مرتبہ ۸۰۰ میٹر کی دوڑ میں شریک ہوا۔ اگر چہ دونوں مرتبہ وہ مقابلہ جیت نہ سکا لیکن ہر مرتبہ مقابلہ ختم ہونے والی پٹی پر اس نے آسمان کی جانب اس طرح بازو پھیلا کر فضا میں ہاتھ لہرائے جیسے عالمی ریکارڈ بنانے میں کامیاب ہوا ہو۔ اس بچّے نے مقابلہ ہارنے کے بعد جو جملہ کہا وہ شاید عقل سلیم رکھنے والا کوئی کھلاڑی بھی نہ کہہ پائے۔ اس نے کہا:

"کوئی بھی مجھے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ناکام رہا ہوں۔ آخری لائین پر تو میں بھی پہنچا ہوں۔"

آوارہ گرد ایدھی ٹرسٹ کے ساتھ رضا کارانہ کام کے اپنے تجربے کے بنیاد پر کہہ سکتا ہے کہ یہ بچے اپنی اہمیت جتانے یا کچھ جیتنے یا حاصل کرنے کے بجائے فقط اپنی موجودگی کا احساس دلانے کو ہی کافی سمجھتے ہیں لیکن اس دنیا کے باسی انہیں اہمیت دینا تو درکنار ان کے وجود کو ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے اور ایسے کسی بچے کو خدائی قہر یا اپنے سر پر مصیبت سمجھ کر

مختلف اداروں کے حوالے کیا جاتا ہے یا گھروں ہی میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ان اولمپکس کے دوران آوارہ گرد کو جس بات نے سب سے زیادہ چونکایا، وہ چار سو میٹر کی دوڑ کے دوران پیش آئی۔ معمول کی طرح مقابلہ شروع ہوا اور ''خاص'' بچوں نے دوڑنا شروع کیا لیکن کچھ لمحوں میں افریقہ سے تعلق رکھنے والی ایک بچّی دوڑتے ہوئے گر گئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے پیچھے آنے والے کھلاڑی اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لیے اسے Walk Over سمجھتا۔ لیکن یہ جو ہوئے دنیا کے کٹھور انسانوں کی نظر میں دنیا کے ساتھ چل نہ پانے والے پاگل اور بے عقل بچےّ! گرنے والی کھلاڑی کے پیچھے آنے والی بچی اپنی دوڑ چھوڑ کر زمین پر گرنے والی ساتھی کو سہارا دینے لگی۔ اطلاعات کے مطابق جب گرنے والی کھلاڑی کھڑے ہوکر دوبارہ دوڑ نہ سکی تو اس کی مدد کو پہنچنے والی بچی اسے مقابلے کے آخری لکیر کی جانب گھسیٹنے لگی۔ تب تک رضا کار بھی پہنچ گئے اور گرنے والی بچی کو سنبھال کر ساتھی کھلاڑی کو دوڑ جاری رکھنے کے لیے کہا تاہم وہ دوڑتے ہوئے بار بار گردن گھما کر اپنی ساتھی کو دیکھتی رہی کہ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے کہ نہیں!

اپنے اندر میں فلورنس نائیٹ انگیل جیسے سینکڑوں صاف و شفاف من رکھنے والی یہ بچی اگر چہ دوڑ کے اختتامی مقام پر سب سے آخر میں پہنچی لیکن موجود تماشائیوں نے کھڑے ہوکر دل کی گہرائیوں سے اس کا جو استقبال کیا وہ شاید ورلڈ کپ جیتنے پر عمران خان، فٹ بال عالمی کپ جیتنے پر میرا ڈونا اور ومبلڈن جیتنے پر اسٹیفی گراف کے حصہ میں بھی نہ آیا ہو۔

آوارہ گرد کو اپنے ارد گرد خود غرض دنیا میں کسی دوسرے کے لیے ایسا انسانی رویہ نظر نہیں آتا دوسروں کو تو چھوڑیں خود کھیلوں کے میدان میں بھی Sport'sman's spirit نظر نہیں آتی۔ حال ہی میں جب کمر کے زخم مندمل ہونے پر دو سال ٹینس کی دنیا سے باہر رہنے کے بعد واپسی پر مونیکا سیلز کو زخمی ہونے سے قبل کی اس کی دنیا کے پہلے نمبر کے کھلاڑی کی حیثیت دینے کا معاملہ سامنے آیا تو کئی ایک کھلاڑیوں نے ناک بھوں چڑھائی تو دوسری جانب کرکٹ میں اکثر بالر اپنے فن سے کھلاڑی کو آؤٹ کے بجائے بال سے ڈرانے یا زخمی کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آئے ہیں۔

''دانش مند اور عقل مند دنیا'' کے لوگ تو کوشش کر کے دوسروں کو دھکّا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر اس معذور لڑکی کے اس رویئے کا سبب کیا تھا؟ آوارہ گرد کا خیال

ہے کہ انسان اپنی فطرت میں ہر لحاظ سے انسان دوست ہی ہے لیکن اس کے اردگرد کی دنیا اور اس کی مادی ضروریات اسے کمینگی بھرے رویے اور خودغرضی سکھاتی ہیں۔

آوارہ گرد کراچی کے کچھ ایسے اداروں میں گیا ہے جہاں ذہنی اور جسمانی طور پر اپاہج بچوّں کو سنبھالا اور پالا جاتا ہے۔ وہاں ایک بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ ان بچوں کا آپس میں اور باقی دنیا کے جانب تعلق اور رویہ ہم ''باشعور اور باحواس'' افراد سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ آوارہ گرد کو حال ہی میں حیدرآباد سے کراچی آتے ہوئے بس میں بھی ہوا جب اس کے ایک دوست کا ذہنی طور پر ''اپاہج'' بیٹا بار بار دیکھتا رہا کہ آوارہ گرد مناسب طریقے سے بیٹھا ہے کہ نہیں، اسے کوئی مسئلہ تو نہیں۔ وہ بار بار مسکرا کر آوارہ گرد کی جانب دیکھ رہا تھا کہ جیسے اسے سفر کی تھکاوٹ سے نہ گھبرانے کا حوصلہ دے رہا ہو۔

کسی جسمانی یا ذہنی حس سے محروم بچوں کے اس حسّاس پن پر اگر کسی کو کوئی شک ہے تو وہ کسی دوپہر کو کراچی کے بندر روڈ پر نمائش چورنگی چلا جائے، جہاں جسمانی اور ذہنی طور پر سالم لوگ گاڑیوں پر سوار ہونے یا راستہ پار کرنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں لیکن قریب ہی گونگے بہرے اور نابینا بچوں کے اسکول کے طالب علم گاڑی میں سوار ہوتے یا راستہ پار کرتے ہوئے اپنی فکر کرنے کے بجائے اپنے ساتھیوں کی فکر کرتے ہیں کہ وہ ٹھیک تو ہیں۔ اگر کسی گاڑی والے کی لاپرواہی سے ان کے کسی ساتھی کو معمولی سی بھی تکلیف پہنچ جائے تو وہ امریکی نیگروز کی طرح ہنگامہ کرنے میں دیر نہیں کرتے!

بس آوارہ گرد کی اتنی ہی فرمائش ہے کہ ایسے بچوں کو اس دھرتی کا حصّہ سمجھا جائے اور انہیں دھتکارنے کے بجائے مناسب حیثیت دے کر ان سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو اپنا بنانے کا رویہ سیکھا جائے۔

# New Faces of Sindh

پچھلی رات آوارہ گرد حسب معمول ایک باکڑہ ہوٹل پر کھانا کھا رہا تھا کہ اس کے پاس دو کتابیں دیکھ کر پانچ چھ برس کے بہتی ناک والے دو مینگھواڑ بچے اُس کی کتابوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں دیکھنے یا محسوس کرنے لگے۔ ان بچّوں کے سوالات بڑے عجیب تھے۔ ''یہ کتابیں ہیں؟ تم اسکول میں پڑھتے ہو؟ کس جماعت میں؟'' جب آخری سوال کے جواب میں آوارہ گرد نے انہیں انگلیوں کے اشارے سے دوسری جماعت میں پڑھنے کا بتایا تو ننگے پیروں والے ان بچّوں میں سے ایک نے اپنے چہرے پر برتری کے تاثرات کے ساتھ آوارہ گرد کو بتایا کہ وہ تیسری جماعت میں پڑھتا ہے اور پھر دیر تک فضا میں انگلیوں سے لکھتا رہا۔

آوارہ گرد کو یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ یہ دونوں بچّے اُسے مستقبل کے سندھ کے نئے چہرے لگے۔ پھر آوارہ گرد دیر تک سندھ کے ان نوجوان اور باصلاحیت افراد کے بارے میں سوچتا رہا جن کے سامنے ذہنی طور پر بوڑھی نسل کی شکست کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

آوارہ گرد کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ Gap نسلوں کے درمیان نہیں بلکہ Gap رابطہ اور خیالات کی ہم آہنگی کی غیر موجودگی کا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آوارہ گرد کی ذہنی ہم آہنگی ہری پگڑی باندھنے اور بیچ چوراہے پر بھی بیٹھ کر پانی پینے والے اپنے کسی ہم عصر مذہبی جنونی

سے ہوتی نہ کہ خود سے بہت زیادہ عمر والے رحیم بخش آزاد سے۔

آوارہ گرد کی رائے میں حالیہ دور میں نوجوانوں کے اپنے پس منظر اور بالخصوص بڑی عمر کے افراد سے کٹ جانے کا بڑا سبب تیز رفتار سماجی ترقی ہے جو کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ڈش اینٹینا کی صورت میں آوارہ گرد کے دیس والوں کو بھی حاصل ہورہی ہے۔ اس ترقی کی وجہ سے جہاں اس سے مستفیذ ہونے والے اپنے سماج کی کائی لگی رسومات اور اطوار پر سوال اٹھارہے ہیں وہاں ذہنی طور پر پس ماندگی کے شکار اسے اپنے ذاتی چودھراہٹ ختم ہونے کی ایک علامت سمجھتے ہوئے منفی اور صدیوں پرانے سماج میں توڑ پھوڑ کا سبب بتارہے ہیں۔

آوارہ گرد کی رائے میں سندھ کا سماج بھی اپنے عبوری دور کے اُس مرحلے پر پہنچ چکا ہے جسے بہائی عقیدے کے بانی بہا اللہ نے حاملہ عورت کے زچگی سے قبل کے دور سے تشبیہہ دی تھی۔ بات ہے بھی درست کہ انسان کی پیدائش کی بے مثل حالات سے قبل درد برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ سو آوارہ گرد کی رائے میں سندھ کی سماجی ترقی کی پیدائش کی اس زچگی میں دایہ کا کردار ادا کرنے والوں کو جتنا خراج پیش کیا جائے وہ کم ہے۔

''سماجی ترقی کی دایہ'' آوارہ گرد ہر اُس فرد کو کہتا ہے جو سماج کی حالیہ گردش سے تضاد میں آکر ترقی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ہوٹل پر بہتی ناک والے مینگھواڑ بچوں سے لیکر سوئمنگ کا مقابلہ جیتنے والی ثنا داؤد پوتہ تک، جیکب آباد کے دور دراز اور قبائل سماج میں ہائی اسکول کی طالبات سے لے کر سندھیوں کی روایت کے برعکس لاہور کے ''پردیس'' جاکر مصوّری کے ذریعے کما کر نیشنل کالج آف آرٹس میں پڑھنے والے ساجد قریشی اور احمد علی منگنھار تک، حویلی میں ظلم سہنے والی عورتوں اور کالی بن کر موت کی وادی کی سیر کرنے والیوں کی داستان لکھنے والی نفیسہ شاہ سے لے کر کراچی اسٹاک ایکسچینج کے صدر بننے والے شکار پور کے جہانگیر صدیقی تک، غیر سرکاری تنظیموں اور ان کے کارکنوں کو تربیت دینے والے ظفر جونیجو سے لے کر فیصل آباد کی انجینئرنگ یونیورسٹی سے ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرکے رائے ونڈ کے ایک کارخانہ میں کام کرنے والے گمبٹ کے نوجوان تک، تمام لوگ آوارہ گرد کی نظر میں اپنوں اور غیروں کی زیادتیوں یا کم عقلیوں سے گھائل سندھ کا نیا چہرا ہیں۔ ایسا چہرا جو دانش، فن یا دکھوں کے آنسوؤں سے دھلا ہوا ہے۔ آوارہ گرد کو یقین ہے کہ سندھ کا یہ چہرا دیکھنے والوں کو شاہ عبدالکریم بلڑی والے کا وہ شعر بالکل درست محسوس ہوگا کہ ''آنکھوں کو

آنسوؤں سے سیراب کرو کہ وہ نین کس طرح ساجن دیکھیں گے جن میں میل پڑا ہے۔“

آوارہ گرد تصور کی آنکھ سے اس سندھ کو قاضی فیض محمد کے ناول ”بائیس سو بائیس“ کی سچی تصویر کے طور پر دیکھتا ہے، جس میں سندھ کے باسی بھی کمپیوٹر دور میں پوری دنیا کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں Amusement اور Themc پارک ہیں جہاں سورج ڈھلنے کے بعد چاند یا لالٹین کی دھندلی روشنی کے بجائے کریش لائیٹ کی روشنی میں دنیا کا کارو بار چلتا ہے۔ جہاں پیغامات کی ترسیل کے لیے صدیوں پہلے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ڈاک یا فون کے بجائے جدید ترین الیکٹرانک وسائل کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں بے عقل علم کے بجائے تحقیقی اور سائنسی معلومات کا راج ہے۔

بس آوارہ گرد کی اتنی فرمائش ہے کہ اگر ایسی سندھ اُس کی غیر موجودگی میں ہو تو کوئی اُسے یاد ضرور کرے تاہم اگر کوئی اُسے یاد نہ بھی کرے گا تب بھی وہ اس سندھ میں سانس لے رہا ہوگا کیوں کہ اس سندھ کے سپنے دیکھنے والوں میں وہ بھی شامل ہے یا تھا۔

☆......☆......☆

# نجم السحر

شہزادی ڈائنا کی پیرس میں ایک سڑک کے حادثے میں ہلاکت کے بعد عالمی سطح پر جو بحث شروع ہوئی اُس میں سب سے دلچسپ پہلو شاید یہ ہے کہ کیا ڈائنا کے پرستار بھی مارلن منرو، جان لینن اور چے گویرا کے پرستاروں کی طرح ''پیروکاروں کے گروہ'' (Cult) میں تبدیل ہوجائیں گے؟ دوسری جانب آوارہ گرد کے ایک دوست نے یہ نکتہ اٹھایا کہ جن لوگوں کی شخصیت میں Spark (چنگاری) ہوتا ہے وہ بھڑک کر جلدی بجھ جاتے ہیں۔

آوارہ گرد اس بات پر سوچتا رہا ہے کہ کیا انہیں یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ اُن کی ذات کا شعلہ شب کے پچھلے پہر کے دیپ کے مانند ہے اور وہ نجم السحر کی طرح پلک جھپکنے میں نظروں سے اوجھل ہوجائیں گے کہ اپنے ذمّہ کام مکمل کرنے کے لیے حد سے زیادہ پھرتی اور جلدی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

چنگاری بن کر چھا جانے والوں میں صرف ڈائنا ہی نہیں، ہالی ووڈ کی اداکارہ مارلن منرو نے اپنی مختصر زندگی میں جو شہرت حاصل کی وہ آج بھی اہم شخصیات کی تمنا بنی ہوئی ہے، جوانی کے دنوں میں گولی کا نشانہ بننے والے پاپ میوزک کا بڑا نام جان لینن اپنی زندگی میں ہی شہرت کی بلندیوں پر تھے، چے گویرا اپنی زندگی میں اور اُس کے بعد بھی اپنے ہم خیال دوستوں اور جدو جہد کے ساتھیوں کے لیے روشن مشعل اور دشمنوں کے لیے اجل کا پیغام بنا ہوا ہے۔

اگر ان چنگاری کی صورت چھا جانے والی شخصیات سے مذہبی لوگوں کا ذکر نکال بھی دیا جائے تب بھی ہر شعبہ اور ہر دیس میں ایسے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم نظر آتا ہے۔ حاکم، ادیب، شاعر، دانش ور، رہ نما، تھیٹر کی دنیا کے شہسوار اور دیگر۔ آوارہ گرد کو اپنی طبعی عمر پوری ہونے سے قبل رخصت ہوجانے والے یہ تمام افراد اپنے کام میں ''دیو'' نظر آئے ہیں۔

یونانی سپہ سالار سکندر اعظم کو چاہے ہم حملہ آوروں کی صف میں رکھیں۔ لیکن بتیس سال کی عمر میں دنیا کے بڑے حصّے کا فاتح آوارہ گرد کی رائے میں فقط سپاہی نہیں تھا۔ یہی بات ایرانی شاعرہ طاہرہ قرۃ العین پر بھی ثابت ہوتی ہے جنھوں نے اپنی چھتیس سالہ زندگی کے دوران مذہبی یا نسوانی اور ادبی یا شاعرانہ تحریکوں پر اپنے ایسے اثرات مرتّب کیے ہیں کہ ان کے مذہبی یا سماجی نظریات سے لاکھ اختلافات کے باوجود انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہودی لڑکی این فرینک کے لیے شیخ ایاز کی تحریر کردہ سطریں کہ اگر وہ اپنی جوانی کے ابتدائی برسوں میں نازی گیس چیمبر میں ماری نہ جاتی تو آگے چل کر عظیم مصنفہ ہوتی، لیکن کیا عظمت کے لیے طویل عمر اور بہت زیادہ لکھنا ہی شرط ہے؟ آوارہ گرد طاہرہ قرۃ العین سمیت اُن تمام افراد کے نام ممتاز سمجھتا ہے جو نے اپنے اندر کی آواز کو Respones دینے سے ذرا نہیں ہچکچائے اور کٹھور دنیا کی نفرتوں کا نشانہ بنتے ہوئے اپنی جانیں نثار کرگئے۔ کسی شاعر نے ایسی شخصیات کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے کہ:

کرو نہ فکر، ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل، چراغوں میں ڈالنے کے لیے

آوارہ گرد کا دیس برصغیر بھی ایسے سپوتوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ بھگت سنگھ اور ہیموں کالانی کو اُن کے اندر کی تپش نے بیٹھنے نہیں دیا اور وہ دنیا کی مالک کہلانے والی برطانوی سلطنت سے ٹکرا کر فنا ہوگئے۔

آوارہ گرد کی شعوری زندگی میں ذوالفقار علی بھٹو یہ ریت جاری رکھنے والے رہے ہیں جنھوں نے ہر کام میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کیا کہ جیسے اُن کے پاس کام تو زیادہ تھے البتہ وقت کم۔ آوارہ گرد اپنی ایک آئیڈیل بے نظیر کو اپنے والد کی طرح شعلے کی صورت محسوس نہیں کرتا البتہ اختلافات کے باوجود ان کے بھائیوں مرتضیٰ اور شاہنواز میں یہ وصف دیکھتا ہے۔

برصغیر کے فخر بھرے وجود کو ایک انوکھی شان بخشنے والا سرمد بھی اس حلقہ میں شامل ہے جو

# بین الاقوامیت۔ جدوجہد سے کوکا کولا کلچر تک

حارث خلیق نے ''ارتقا'' نامی جریدے میں مشرقی یورپ کے ممالک سے متعلق اپنے مشاہدات و تجربات کو کچھ ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ جب سوشلسٹ بلاک قائم تھا تو ان ممالک میں پاکستانی طلبہ (بائیں بازو کی جماعتوں سے تعلق رکھنے کی بنا پر) پڑھنے آتے تھے لیکن سوشلسٹ بلاک اور بالخصوص سوویت یونین کے زوال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ سابقہ سوشلسٹ ممالک پر اب کوکا کولا اور پیزا ہٹ کا راج ہے اور اب ہم ان (سابق سوشلسٹ) ممالک سے اُس عالمی ثقافت میں جُڑ گئے ہیں جسے حرف عام میں ''کوکا کولا کلچر'' کہا جاتا ہے۔

مشرقی یورپ، ارتقا اور حارث خلیق میں ایک مماثلت سوشلسٹ پس منظر کی ہے۔ ان تینوں میں حارث خلیق کچھ کم مشہور ہیں، اس لیے بات اس سے شروع کریں۔

انجینئرنگ کے ڈگری یافتہ اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہو کر بائیں بازو کی سیاست کرنے والا حارث خلیق بھی کئی سابقہ سوشلسٹوں کی طرح اب ایک غیر سرکاری تنظیم میں کام کرتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں یکساں اچھی شاعری کرنے والا حارث انسانی حقوق کے لیے مصروف تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل کا سرگرم کارکن اور اس کے کراچی گروپ کا حالیہ صدر بھی ہے۔ اُس نے مشرقی یورپ کا مذکورہ سفر بھی ایمنسٹی انٹرنیشنل کے رکن کے طور پر کیا تھا۔ آوارہ گرد حارث کو اُن مست آوارہ گردوں میں سے ایک سمجھتا ہے جو اپنے کام سے ایمان

دار اور باقی معاملات میں لاپروا ہوتے ہیں۔

ارتقا ماضی میں کمیونسٹ یا بائیں بازو کے مختلف گروپوں کے ساتھ کام کرنے والے ایسے ہم خیال دوستوں کی مشترکہ کاوش ہے جن کا خیال ہے کہ سماج میں کوئی بھی مثبت تبدیلی علمی ادراک کے بغیر ممکن نہیں اور ہمارا معاشرہ علمی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے، اس لیے سیمیناروں اور جرائد و کتب کے ذریعے سماج میں شعور پیدا کیا جائے۔ دیگر اَن پڑھ اور لاعلم لوگوں کی طرح آوارہ گرد نے بھی ''ارتقا'' سے بہت کچھ سیکھا ہے اور آوارہ گرد کی خواہش ہے کہ آوارہ گرد سمیت دیگر دوست بھی ''ارتقا'' اور اس کے سرگرم ساتھیوں پر تفصیل سے کچھ لکھیں۔

ماضی میں آوارہ گرد سمیت تیسری اور استحصال زدہ دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کے لیے مقدس حیثیت رکھنے والا مشرقی یورپ پچھلے کچھ برسوں کے دوران نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہے۔

مشرقی یورپ کے ماضی کی ایک اہم شناخت حارث خلیق کی بات سے ہی ظاہر ہے۔ جب سوشلزم ایک بلاک کی صورت میں موجود تھا تو دنیا کا یہ خطہ آزادی، برابری اور حقوق کی جنگ میں سرگرم افراد کے لیے بین الاقوامیت کا مرکز تھا۔ اُن دنوں میں آوارہ گرد کے دیس سمیت پوری دنیا کے روشن خیال نوجوان تعلیم حاصل کرنے اور بوڑھے مختلف اجلاسوں میں شرکت کے لیے وہاں جاتے تھے۔

آوارہ گرد کو یہ اعتراف کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ اُس کے دیس سے ''ارضی جنت'' کے ممالک کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے والوں کی اکثریت پارٹی رہنماؤں کے عزیز و اقارب کی تھی۔

اس بین الاقوامیت کا دائرہ فقط ان سوشلسٹ ممالک تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ''سامراجی نو آبادی'' بنے ہوئے آوارہ گرد کے دیس میں بھی اِس کے اکثر و بیشتر اظہار ہوتے رہتے تھے۔

فلسطین، کانگو، انگولا، ویتنام، کوریا، چین، کیوبا، گوئٹے مالا، نکاراگوا...... اَن دیکھے اور اَن سنے دیسوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا، جن کے دلوں کے ساتھ آوارہ گرد کے کئی دیس باسیوں کے دل دھڑکتے تھے۔

آوارہ گرد کے دیس میں اس ''سوشلسٹ بین الاقوامیت'' کا پہلا مظاہرہ شاید سعادت حسن منٹو کے روسی افسانوں کے تراجم سے ہوا جو غالباً ۱۹۳۰ء کی دہائی میں شائع ہوئے۔ اس

کے بعد تو صاحب سوشلسٹ تحریروں کا یہاں کی زبانوں میں جیسے سیلاب اُمڈ آیا۔

معاملہ فقط کتابوں کے تراجم اور اشاعت تک محدود نہیں رہا۔ آوارہ گرد کو ۱۸ مارچ کی وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب جنرل ضیا کے بھیانک مارشل لا کے دنوں میں حیدر آباد کے کچھ نوجوانوں نے ایک نیم اندھیری کھولی میں ہوچی منہہ کا جنم دن منایا تھا اور ہوا کی ہر سرگوشی پر بھی تناؤ میں آ رہے تھے کہ کہیں ''سرکاری فرشتے'' تو نہیں پہنچ گئے۔

۱۹۸۲ء میں فلسطینی صابرہ اور شتیلہ کیمپوں پر اسرائیلی حملے کے خلاف احتجاج پاکستانی کامریڈ ہی سڑک پر لائے۔ چے گویرا، لیلیٰ خالد، نگوین وان تروئی، انتونیو گراچی، جیسے سورماؤں کو پوری دنیا کی طرح اس دیس کے انقلابیوں نے بھی اپنا سمجھا۔ کئی ایک تو دنیا کے دوسرے علاقوں میں ہونے والی جدو جہد میں ذاتی طور پر شریک بھی ہوئے۔ اس وقت لاہور کے اچھے افسانہ نگار سمیع آہوجا کا نام آوارہ گرد کے ذہن پر تیر آیا ہے، جنہوں نے فلسطین اور ایران میں وہاں کے انقلابیوں کے ساتھ مسلح جدو جہد کی تھی۔ ہاں! ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بلوچستان کے پہاڑوں پر مسلح جنگ میں امریکہ اور برطانیہ میں زیر تعلیم اوپری طبقات کے کئی پاکستانی نوجوان عملی طور پر شریک ہوئے تھے۔ برطانیہ میں رہائش پذیر پاکستانی نژاد دانش ور اور فلمساز طارق علی کی شہرت یورپ میں طلبہ تحریک کی رہنمائی کا ثمر ہے۔

ایسی ہی بین الاقوامیت کے زیر اثر لاطینی امریکہ سے تعلق رکھنے والا جیکب لیلیٰ خالد کے ساتھ اسرائیلی جہاز اغوا کرنے کی کوشش کے دوران اسرائیلی گولیوں کے نذر ہو گیا۔

آوارہ گرد جدو جہد و انقلاب کی بین الاقوامیت اور کوکا کولا وسی این این کلچر کی بین الاقوامیت کا تجربہ بھگتنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ حالیہ بین الاقوامی کلچر نے لوگوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے انسانی خود غرضی اور کمینگی اُن پر حاوی ہوگئی ہے جب کہ سابقہ بین الاقوامیت کا ایک مقصد (پھر چاہے اُسے خیالی یا سراب ہی کہا جائے) ضرور تھا، جس نے لوگوں میں اجتماعیت کا ایک راستہ ضرور پیدا کیا تھا۔

آوارہ گرد یہ فرمائش تو نہیں کرتا کہ سابقہ دور ہر صورت میں واپس لایا جائے البتہ اُس کی اتنی خواہش ضرور ہے کہ کسی بھی بین الاقوامی کلچر میں انسانی عظمت مقدم ہو اور بچّے اور نوجوان کوکا کولا اور برگر تو کھائیں پئیں لیکن انہیں باوردی سرنگوں اور گولیوں کا نوالہ نہ بنایا جائے۔

☆......☆......☆

# عزرائیل کو شکست دینے کی تمنّا

اخباری اطلاعات کے مطابق سول اسپتال کراچی کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ (SICU) کے بستر نمبر چار پر سات سالہ شائستہ داخل ہے۔ ویسے تو ہر روز پوری دنیا میں لاکھوں لوگ اسپتال کے بستر پر ہوتے ہیں لیکن شائستہ دو وجوہات کی بنا پر عجیب وغریب مشینوں کے گھیرے میں ہے۔ ایک تو اُسے Porphyria نامی ایک خطرناک بیماری ہے جس کا کوئی حتمی علاج نہیں۔ دوسرا سبب جو آوارہ گرد کی نظر میں زیادہ اہم ہے، وہ اس کے والدین کا غریب ہونا ہے کیوں کہ وہ شائستہ کی موت کو وقتی طور پر سہی، پیچھے دھکیلنے والی امریکی شہر شکاگو میں میسّر بارہ ہزار روپوں میں ملنے والے دس انجکشن خرید نے کی سکت نہیں رکھتے۔ شائستہ کا الیکٹریشن باپ اور ماں اپنی بیٹی کے علاج کے لیے اپنا ذاتی گھر بیچ کر اپنے رشتہ داروں کے ہاں رہ رہے ہیں۔ لاعلاج مرض میں مبتلا شائستہ کی ماں اور اُس کے ڈاکٹر ابھی تک مایوس نہیں ہوئے ہیں کہ اس کی ماں اپنے پورے یقین کے ساتھ کہتی ہیں کہ وہ یقیناً ٹھیک ہوجائے گی اور دوبارہ اپنے بھائی بہن کی انگلی پکڑ کر اسکول جائے گی۔ شائستہ کا علاج کرنے والے ایک ڈاکٹر کے بقول عزرائیل اور ان کے درمیان مقابلہ ہے اب دیکھیں کہ کون جیتتا ہے! اگرچہ ہے تو حساس معاملہ لیکن آوارہ گرد اس معاملے میں یہی کہے گا کہ ہر صورت میں عزرائیل کو شکست اور شائستہ کے ڈاکٹروں کو فتح ہونی چاہیے!

جیتے جاگتے انسانوں کا بیماری اور ڈاکٹروں سے وہی تعلق ہے جو کسی جان دار کا آکسیجن اور پانی سے ہوتا ہے تاہم انتہائی الیمے کی بات تو یہ ہے کہ مسیحا کہلانے والے ڈاکٹروں کی اکثریت اپنے پیشے سے ایمان دار نظر نہیں آتی۔ آوارہ گرد کے اس جملے پر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ڈاکٹروں کی اکثریت بیمار انسان کو صحت یاب کرنے کے بجائے پیسے کمانے کے لیے گھر آنے والی لکشمی کے انتظار میں ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ایک پرائیوٹ اسپتال کے ڈاکٹر شائستہ کے والدین سے ستر اسّی ہزار روپے نہیں بٹورتے اور وہ بھی اس قیمت پر کہ وہ اس کی بیماری کی تشخیص بھی نہیں کر پائے!

بہرحال ایک بات تو طے ہے کہ آوارہ گرد کے دیس میں بھی کچھ ایسے سرپھرے ڈاکٹر ضرور ہیں جنہیں مسیحا کہتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ خود مسیحا لفظ بھی ان کی پذیرائی کا مکمل حق ادا نہیں کرتا۔

حاملہ عورتوں کی نارمل ڈلیوری کرانے کے بجائے کچھ زیادہ پیسے کمانے کی لالچ میں آ کر آپریشن کے ذریعے بچّہ پیدا کرنے کی کوشش میں زچہ و بچہ کی زندگی خطرے میں ڈالنے والے ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں کے مقابلے میں موت کی آغوش میں آئے ہوئے انسانوں کو دوبارہ زندگی کے دھنک رنگ لوٹا دینے والے سرجن ادیب رضوی کو فرشتہ کہنا خود فرشتے کو عزّت دینا نہیں تو اور کیا ہے! آوارہ گرد کی اس بات سے شاید ہی کوئی اختلاف کرے کہ ڈاکٹر ادیب رضوی اگر فقط ایک سال صرف پرائیوٹ پریکٹس کریں تو شاید پاکستان کا امیر ترین فرد بن جائیں لیکن وہ سول اسپتال کراچی میں یورالوجی وارڈ چلاتے ہیں اور آوارہ گرد سمیت کئی لوگوں کی معلومات میں ہے کہ وہ اکثر خوش حال لوگوں کا علاج معالجہ بھی وہیں کرتے ہیں اور امیر مریضوں سے فیس کے نام پر نوٹوں کی گڈیاں لینے کے بجائے اپنے وارڈ کے لیے کوئی مطلوبہ چیز حاصل کرتے ہیں۔

آوارہ گرد کا مشاہدہ تو یہی بتاتا ہے کہ شاید یہی وارڈ ہے جس میں محمود و ایاز کو یکساں دھیان اور علاج حاصل ہوتا ہے۔ سندھی کے افسانہ نگار طارق عالم ابڑو سے لے کر دادا بھائی کی بھتیجی تک اور کوہستان کے دور دراز گاؤں سے آنے والے دیہاتی سے لے کر سابقہ سیاسی قیدی احمد کمال وارثی تک اَن گنت لوگوں نے اس وارڈ اور بالخصوص اس کے فرشتہ صفت سرجن ڈاکٹر ادیب رضوی کے علاج سے زندگی کا دوبارہ مزا لیا ہے۔

ویسے تو آوارہ گرد کے دیس میں وزیرِاعظم محترمہ بےنظیر بھٹو کے آبائی شہر نوں ڈیرو میں

وزیر اعظم ہاؤس سے کوئی سوا دو سوگز کے فاصلے پر ''بے نظیر بھٹو سوشل ویلفیئر میڈیکل سینٹر'' بھی ہے، جس کی بدحالی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آوارہ گرد جیسا Rough, Tough شخص بھی اس کے آپریشن تھیٹر میں شیو بنانے کو Unhygenic سمجھتا ہے۔ دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ اس میڈیکل سینٹر کا افتتاح خود وزیر اعظم نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ اب ہماری وزیر اعظم کو کون بتائے کہ، نصرت جیسی مائیں اور بخت آور اور بلاول جیسے بچے اس ملک کی کسی دوسری بستی میں تو کیا بلکہ خود اُس کے اپنے شہر میں اُس کے اپنے ہی نام پر بنے ہوئے اس میڈیکل سینٹر سے علاج کے بجائے مزید بیماریاں حاصل کرتے ہیں۔ بیجنگ کانفرنس میں سب سے زیادہ پذیرائی حاصل کرنے والی مقرّرہ بے نظیر کو کوئی جا کر بتائے کہ خود اس کے اپنے شہر میں پچھلی پچیس برسوں سے غریب عورتوں کا مفت علاج کرنے والی ڈاکٹر بلقیس فقط اس لیے لاڑکانہ ضلع کی تمام تحصیلوں میں جانے سے قاصر ہیں کہ کوئی بھی وفاقی یا صوبائی ادارہ انہیں گاڑی دینے کو تیار نہیں! اپنے شوہر کے ہاتھوں تشدّد کا نشانہ بننے والی زینب نور کو بانہوں میں بھر کر روہانسی ہونے والی بے نظیر کو کون بتائے کہ اس کے نام پر قائم میڈیکل سینٹر کے نام پر اس کے کئی ایک ''ہمدرد'' اپنے پیٹ بھر رہے ہیں اور آوارہ گرد نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں حبیب جالب کی اس بات سے متفق ہوتا جارہا ہے کہ ابھی تک ملک کی بختاوریں دکھی ہیں اور دن فقط زرداروں کے ہی تبدیل ہوئے ہیں!

بہر حال ایک بات تو طے شدہ ہے کہ ہمارے عمل ہی ہماری نیت اور مقاصد کا اظہار ہوتے ہیں آوارہ گرد یہ سوچنے پر حق بہ جانب ہے کہ جو حکومت ایک ایسے ڈاکٹر کو محکمۂ صحت کا سیکریٹری مقرر کرے جو اپنے وارڈ میں نہ جانے کی وجہ سے مشہور تھا، وہ اپنے نعرے ''صحت اور علاج ہر ایک کے لیے'' سے کس طرح ایمان دار ہوسکتی ہے۔ یہ بات آوارہ گرد اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہا ہے کیوں کہ لیاقت میڈیکل کالج جامشورو اسپتال میں اس پروفیسر کے وارڈ میں بتیس دن داخل رہنے کے دوران اُس نے ایک دن بھی پروفیسر کو اپنے وارڈ میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ غیر حاضری والی یہ صورت حال اُس صورت میں تو قابلِ برداشت ہوسکتی ہے جب وارڈ کے رجسٹرار اور دیگر ڈاکٹر اہل ہوں! لیکن اس وارڈ میں آوارہ گرد نے دیکھا کہ بیس بائیس سال کے ایک نوجوان کے سینے کا ایکسرے کسی بوڑھے شخص کے ایکسرے سے ساتھ تبدیل ہوگیا اور ڈاکٹروں نے اس نوجوان کو ٹی بی کے آخری مرحلے کا مریض کہہ کر اس کے زندہ ہونے کو

معجزہ کہا۔ اگر چہ پرائیوٹ طور پر کرائی گئی تشخیص کے مطابق یہ نوجوان ٹی بی کا مریض نہیں تھا لیکن اس کو ہونے والی ذہنی کوفت اور خاصے عرصے تک ٹی بی کے ہونے والے علاج کے نتیجے میں اس کی صحت پر پڑنے والے منفی اثرات کا ازالہ......!

تاہم آوارہ گرد کے دیس میں آنکھوں کا ماہر ڈاکٹر صالح میمن بھی ہے جو اپنے سرکاری اسپتال تو روز جاتے ہیں لیکن اپنی پرائیوٹ کلینک پر بھی اکثر مریضوں سے فیس نہیں لیتے۔ اگر چہ ڈاکٹر صالح میمن کے کئی ہم پیشہ ڈاکٹر سرکاری اسپتال میں جاتے ہی نہیں اور اگر جاتے بھی ہیں تو وہاں آنے والے مریضوں کو اپنی پرائیوٹ کلینک میں آ کر علاج کرانے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن وہ یا ان جیسے کئی ''پاگل'' ڈاکٹر بیمار انسانوں کو ٹھیک کرنا ہی اپنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں۔

آوارہ گرد وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جب کراچی اور اس کے گرد و نواح میں پھیلنے والی Black Fever کی وبا کے دوران وہ ایدھی ٹرسٹ کے کچھ رضا کار ساتھیوں کے ساتھ گڈاپ سے کوئی بیس پچیس کلو میٹر دور پہاڑ کی جانب حفاظتی ٹیکے لگانے گیا تھا۔ وہاں ایک چار پائی پر لائی گئی ایک نوجوان خاتون کی ٹانگ پر گھٹنے اور پنڈلی کے درمیان ٹویوناسک گلاس جتنا ایک زخم تھا، جس میں کیڑے پڑ چکے تھے لیکن ارد گرد کوئی ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا علاج نہیں ہو پایا تھا۔ کیا آوارہ گرد کے دیس کے لوگوں کا یہی نصیب ہے!

اس بدنصیبی کے لیے آوارہ گرد کسی پنجابی یا مہاجر کی ''سندھ دشمنی'' کو ذمہ دار نہیں سمجھتا بلکہ سندھ کی دیہات کے کوٹے پر میڈیکل کالج میں آ کر ''سندھ دھرتی کے سپوت'' کہلوانے والے ہی آوارہ گرد کی نظر میں اس کے لیے جواب دار ہیں، جو تقریریں کرتے ہوئے تو سندھ اور سندھ کے باشندوں کے لیے قربانیاں دینے اور جان نثار کرنے کی دعویٰ کرتے ہیں لیکن عملی طور پر ڈاکٹر بننے کے بعد بقول اُن کے گاؤں میں ''سوشل لائف نہ ہونے'' کی وجہ سے دیہات کا رخ نہیں کرتے۔

آوارہ گرد کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ سندھ کے دیہات میں طبی کیمپ منعقد کرنے والے ڈاکٹروں کی اکثریت غیر سندھیوں کی ہوتی ہے۔ سندھی بولنے والے ماہر ڈاکٹروں کی اکثریت کو اپنی ایئر کنڈیشنڈ کلینکوں سے باہر نکل کر مساکین کو دیکھنے کی ہمت نہ جانے کیوں نہیں ہوتی۔

آوارہ گرد کی بس اتنی ہی خواہش ہے کہ اُس کے دیس کے تمام ڈاکٹر لاچار اور بے بس

لوگوں کو موت کے منہ میں جانے/سے بچائیں اور کوئی بھی ان دیکھا ہاتھ ڈاکٹر سلیم دانش اور ڈاکٹر جوکھیو کو قتل کرنے کے لیے نہ اٹھے، کیوں کہ اس سے نہ صرف ڈاکٹر قتل ہوتے ہیں بلکہ آوارہ گرد کے واقف کار پلاسٹک سرجن ڈاکٹر بابر اور آوارہ گرد کے ایک ''پاگل'' ڈاکٹر دوست کی ڈاکٹر بیوی جیسے اَن گنت با صلاحیت ڈاکٹر اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتے ہیں جہاں زندگیاں بخشنے والے ہاتھوں کی پہلے ہی قلت ہے!

☆......☆......☆

# گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں کراچی کے نوحے

پچھلے دس دنوں کے دوران آوارہ گرد نے ہنگاموں، ہڑتالوں، گولیوں اور پولیس، رینجرس اور قانون نافذ کرنے والوں کے محاصرے میں شہر کراچی میں ادب وفن کی دو محفلوں میں شرکت کی۔ ان میں سے ایک تقریب تو براہ راست آج کے دور کے میڈرڈ اور بیروت (کراچی) سے متعلقہ تھی۔ یہ محفل گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ''رائٹرس فورم'' کی جانب سے شہر کے شاعروں کی کراچی میں رہنے کے تجربے اور ان کے کرب اور رنگینیوں سے متعلق شاعری کی تھی۔ اس شاعرانہ محفل میں سندھی، اردو، انگریزی، بلوچی اور پنجابی زبانوں کے ایک ایک شاعر کو شاعری سنانے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ آوارہ گرد اس سے قبل ایک مشاعرے میں زیادہ سے زیادہ تین زبانوں کے شاعروں کو سن چکا تھا اس لیے پانچ زبانوں کے شاعروں کو ایک ہی وقت میں سننے کا تجربہ ہی گوئٹے انسٹی ٹیوٹ تک جانے پر راضی کرنے کو کافی تھا۔ پھر وہاں عذرا عباس، رحیم بخش آزاد، جان خاصخیلی اور بابا نجمی کی شاعری اور اس پر آصف فرخی کا تبصرہ ہوتو کون نہیں جائے گا۔ اگرچہ بابا نجمی اس پروگرام میں شریک نہیں ہوسکے تھے لیکن ان کی شاعری بھی سامعین کو سنائی گئی۔

شہر اور اس کی شورش اور اس پر شاعروں کا ردعمل بالکل واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ عذرا عباس، جان خاصخیلی اور عباس حسین (انگریزی کے شاعر) کے پاس حالات کا

فنکارانہ اظہار تو تھا اور ان کی شاعری جمالیات سے بھی بھرپور تھی لیکن نہ جانے کیوں آوارہ گرد کو ان کی شاعری میں کراچی سے وہ عشق نظر نہیں آیا جو رحیم بخش آزاد کے ہاں تمام بند توڑ کر اُمڈ آیا تھا۔ آزاد کی بلوچی نظم میں کراچی کا ذکر ایسے تھا جیسے کسی پریتم سے بچھڑنے والا یا ماں کے بعد یتیم ہونے والا کوئی ٹین ایجر ماضی کی خوشیوں سے محرومیوں کا رونا رو رہا ہو۔ آوارہ گرد کافی عرصے سے بہ آواز بلند یہ کہتا رہا ہے کہ تمام عام لوگ تو کیا سندھ اور بالخصوص کراچی میں رہنے والے زیادہ تر پڑھے لکھے دانش ور بھی ذہنی طور پر نسلی گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور اس شہر اور دیس کی اصل بدنصیبی یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی اس غیر عقلی تقسیم کے بعد لندن کے پیر کا کہنا ہے کہ ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے، جب کہ لکیاری کا لال سندھ کے دور دراز علاقوں میں مسائل میں پھنسی لیکن گولیوں اور بموں سے محفوظ زندگی گزارنے والوں کو کراچی پہنچ کر سندھ کا دفاع کرنے اور اس کے معاوضے میں ملازمتوں اور گھروں کی لالچ دیتا ہے۔ آوارہ گرد صوبے کے اعلیٰ ترین اہلکار کی اس بات کو کراچی پر لشکر کشی تو سمجھتا ہے لیکن اس بات پر اُسے حیرت ہوئی کہ ''وہ کہے پر تم نہ کہو پلٹ کر'' جیسے صوفیانہ فلسفے اور بدھ مت کے عملی اظہار والے سندھ سے کوئی بھی آواز بلند نہیں ہوئی جو اُسے کہے کہ شہر صرف لوگوں کی تعداد سے نہیں بلکہ اس کی روح میں پیوست ہو جانے والے اور اُسے اپنا بنانے والوں سے شناخت ہوتے ہیں نہ کہ ہفتے کے آخری دن پر دیس (کراچی) سے واپس اپنے گاؤں جانے والے پردیسیوں سے۔

آوارہ گرد کا خیال ہے کہ اہل دانش نسلی بنیادوں پر دنیا کے کسی اور شہر میں شاید ہی اتنا تقسیم ہوئے ہوں جتنا کہ ہر دور میں گھاتو کے گھر نہ لوٹنے پر ماتا جی کراچی میں۔ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں کراچی کے نوحے پڑھنے اور اس کے مستقبل کے لیے اُمید کی جوت نینوں میں سجانے کی اس محفل میں بھی ایک دانش ور نے رحیم بخش آزاد کو Non Karachi کہا۔ اب اس بے خبر دانش ور کو کون بتائے کہ جدید کراچی کی بنیادوں میں آزاد کے آباواجداد کا بھی خون شامل ہے۔ دوسری جانب مذہب کے غیر انسانی اور Aggresive پہلوؤں اور رجعت پرست نظریات کا پرچار کرنے والے ممتاز مہر نے روشن خیال اور ترقی پسند مصنفین کی نئی نسل کے ترجمان جان خاصخیلی کو اپنے حلقے کا شاعر قرار دیا۔ اگر یہ حلقہ ایک زبان بولنے کا ہے تو

پھر آوارہ گرد کی رائے میں زنجیر اور سولی بن جانے والے ایسے حلقوں سے دست برداری کا بلند بانگ اعلان کرنا چاہیے کیوں کہ آوارہ گرد سمجھتا ہے کہ دوسری زبان بولنے والوں کی لاکھوں لاشیں بھیجنے کی بات کرنے والے کے بجائے آوارہ گرد کا حلقہ بند ساتھی وہ دوسری زبان بولنے والا ہے جو اس دھرتی کے دُکھ اپنے کینوس یا کاغذ پر نقش کرتا ہے۔ آوارہ گرد سمجھتا ہے کہ اب وہ وقت اپنی بالکل آخری حد تک پہنچ چکا ہے جب ہر ذی شعور اور باعقل فرد بلند آواز سے یہ کہے گا کہ انسانوں کی اس تقسیم میں وہ فریق نہیں ہے اور ایسی تقسیم کرنے والوں سے وہ ٹکرا بھی سکتے ہیں۔

آوارہ گرد کے خیال میں اس دیس کے مصنفین اور دانش ور اس بات سے واقف ہی ہوں گے کہ نازی جرمنی میں جب ہٹلر کے فاشی کتےّ انسانوں کا گوشت نوچ رہے تھے تو وہاں کے ادیب، شاعر اور دانش ور نے اس کی کوئی مزاحمت نہیں کی اور اس کی قیمت انہیں نہ صرف دوسری عالمی جنگ کے دوران بلکہ اس کے بعد بھی طویل عرصے تک تخلیقی طور پر بانجھ ہوجانے کی صورت میں ادا کرنی پڑی جب کہ جنرل فرانکو سے نبرد آزما ہونے کے لیے انٹرنیشنل بریگیڈ کی قیادت میں اسپین اور بالخصوص میڈرڈ میں جنگ کے لیے جمع ہونے والے مصنفین کا تخلیق شدہ ادب عالمی سطح پر انتہائی مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ کیا آوارہ گرد سمیت بے شمار آوارہ گردوں کے شہر کراچی کے لیے کوئی انٹرنیشنل بریگیڈ تشکیل نہیں دی جاسکتی!

اس عرصے کے دوران ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ستارنواز اخلاق حسین کے ساتھ ایک محفل سجائی۔ سنگیت تو ویسے بھی من پر چھائی ہوئی کائی اور دھول مٹّی ہٹا دیتی ہے اور یہ تو تھی ہی لہو میں نہائے شہر کے ایک سو کے قریب باشندوں کی محفل۔ بس صاحب! اخلاق حسین کی ستار پر مضطرب انگلیاں تھیں اور سننے والوں کی داد۔ آوارہ گرد سنگیت کا ماہر تو نہیں لیکن وہ بھی اپنے آپ کو سنگیت کے سحر سے بچا نہیں سکا۔

ستار کے سُر برصغیر بالخصوص جنوبی اور مشرقی ہندوستان میں خوشی اور دکھ دونوں لمحوں میں گونجتے رہے ہیں۔ جدید دور میں برصغیر کے ستار کو پوری دنیا میں شہرت دلانے والے پنڈت روی شنکر کے سوا کوئی نہیں۔ آوارہ گرد کو وہ آڈیو کیسٹ یاد آرہی ہے جس میں پنڈت کا ستار تھا اور طبلے پر پنڈت جیسے ہی مہا کلاکار ذاکر حسین کی سنگت۔ بس صاحب! کانوں کے ذریعے ایسے جادو من میں اُتر رہا تھا کہ بندہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہ پا رہا تھا۔ ایسی ہی کیفیت

سے آوارہ گرد کافی سال پہلے کراچی کے انڈین قونصل خانے میں استاد بسم اللہ خان کی شہنائی سنتے ہوئے بھی گزرا تھا۔

آوارہ گرد کی کچھ خواہشات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پنڈت روی شنکر کو سامنے بیٹھ کر سنا جائے۔ ایسی کوئی ریکھا نہ جانے ہم بدنصیبوں کی ہتھیلی پر ہے بھی کہ نہیں!

آوارہ گرد کو سیاسی موضوع پر بننے والی بھارتی فلم ''نکسلائیٹ'' بھی یاد آرہی ہے جس میں ایک بنگالی پولیس افسر اپنے کمیونسٹ بیٹے کے پولس کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بننے پر کرب کے مارے اس انداز میں ستار بجاتا ہے کہ نہ فقط اس کے بلکہ کٹھور دل رکھنے والے فلم کے ناظرین کے بھی اپنے آنسو نہیں رک پائے تھے۔

ہاں، بات ہورہی تھی ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جانب سے ستار کی محفل کی۔ اخلاق حسین اُس رات دیگر راگوں کے ساتھ ساتھ امیر خسرو کی ٹھمری ''چھاپ تلک سب چھین لی رے مو سے نیناں ملائی کے'' ستار پر بجا کر جیسے امیر خسروؒ کی شاعری کو چھوٹا سا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

امیر خسرو کے حوالے سے آوارہ گرد کی اس رائے سے چاہے کوئی اختلاف کرے لیکن وہ اتنا ضرور کہے گا کہ اگر آج امیر خسروؒ زندہ ہوتے تو نگہت چودھری اور مادھوری ڈکشٹ کے اپنے کلام پر رقص دیکھ کر شاید نظام الدین اولیا کے بچھڑنے کا سارا دُکھ بھول جاتے!

کیا آوارہ گرد ایمنسٹی انٹرنیشنل سے یہ توقع رکھے کہ وہ جس طرح تشدّد کا پرچار نہ کرنے والے ضمیر کے قیدیوں کی آزادی کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہے اُس طرح ہنگاموں میں گرفتار ہمارے شہر کو بھی آزاد کرانے کی مہم چلائے گی!

کافی عرصے سے نہ صرف مقامی تنظیموں بلکہ غیر ملکی ثقافتی مراکز اور سفارت خانوں کی بھی سماجی، ثقافتی اور ادبی نشستوں کا سلسلہ شہر کے غیر یقینی حالات کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا لیکن اب کراچی کے باشندے بھی آہستہ آہستہ میڈرڈ، بیروت اور بوسنیا کے شہریوں کی طرح گولیوں کی بارش اور بموں کی دھول میں تقاریب کرنا سیکھ گئے ہیں۔

آوارہ گرد کی بس اتنی فرمائش ہے کہ ایسی تقاریب منعقد کرنے کا سلسلہ بند نہ ہوتا کہ ایسے حالات لوٹ آئیں کہ ٹین ایجرس زور زور سے گنگنا سکیں:

''اے روشنیوں کے شہر تیری لیلاؤں کی خیر ہو

ان سب سے کہہ دو آج کی شب
جب دیے جلائیں تو
اونچی رکھیں لو۔"

اور حالات سے تنگ آ کر بیرون ملک جا بسنے والی، بچوں کے لیے ونیلا کرمبل کیک بنانے والی آنٹی واپس لوٹ آئے۔

☆......☆......☆

# بخت آور، بے نظیر اور کاریوں کے قبرستان کی آہ و بکا

بخت آور نامی ایک عورت، ایک بیوی، ایک ماں اپنے ہی شوہر اور بیٹے کے ہاتھوں کلہاڑیوں سے ماری گئی۔ اُس کا ''جرم'' وہی پرانا راگ کہ اُس کے ''فلاں'' سے ناجائز تعلقات تھے اور وہ ''کالی'' تھی۔ ابھی چند روز قبل بے نظیر اپنے اُستاد کے ہاتھوں قتل ہوگئی۔ اس کا ''جرم'' اُس نے اپنے اُستاد کی بیوی بننے سے انکار کر دیا تھا۔ مندرجہ بالا دونوں نام آوارہ گرد کے دیس میں جتنی عزّت و تعظیم رکھتے ہیں اتنا ہی ان ناموں والی خواتین کے ''جرائم'' شرمندگی اور ناک کاٹنے والے احساسات۔ کیا کوئی اپنے آپ کو اُس وقت بیسویں صدی کا شعور رکھنے والا کہہ سکتا ہے جب اس کے دیس میں عورت انسان نہیں بلکہ ٹھیکری کا ایسا برتن ہو کہ جب اچھا نہیں لگا تو توڑ دیا!

اِس بات میں بحث کی گنجائش ہی نہیں کہ اپنی فصل زمینداروں سے بچانے کے لیے بندوق اُٹھا کر زندگی کے آخری پل تک لڑنے والی بخت آور اور جنرل ضیاء کے مارشل لا سے جنگ کرنے والی بے نظیر بھٹو بیسویں صدی کے دوران سندھ کی تاریخ میں عورتوں کے روپ میں مزاحمت کی ناقابلِ فراموش علامتیں ہیں۔ ان دونوں خواتین کی جدو جہد کو سندھ کے باشندوں نے ایسی تعظیم دی کہ سات قران پکاری جانے والی اور ایک قرآن کے ساتھ بیاہی جانے والی اپنی بیٹیوں کے نام بھی بے نظیر اور بخت آور رکھنا شروع کر دیے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔

یہ نام اتنی مقدس حیثیت حاصل کر گئے ہیں کہ خود مزاحمت کی علامت بے نظیر کی بیٹی کا نام بھی بختت آور رکھا جاتا ہے۔ اب جب آوارہ گرد کی آئیڈیل خواتین کی ہم نام عورتیں بھی مردوں کی ''عزت'' اور غیرت کا شکار بنیں تو پھر آوارہ گرد کس سے شکایت کرے!

کیا آوارہ گرد زینب نور کو تشدّد کا نشانہ بنانے والے اُس کے شوہر کی گرفتاری کے لیے اسلام آباد کے اسپتال میں روہانسی ہوکر پولیس اہلکاروں کو ڈانٹنے والی بے نظیر سے یہ اُمید رکھے کہ وہ مردوں کی مردانگی کا شکار بننے والی بخت آور اور بے نظیر کے مجرموں کو بھی سزا دلائیں گی!

''کالی'' کہہ کر عورتوں کو قتل کرنا سندھ کی وہ مکروہ رسم ہے، جس سے کوئی چاہے کتنا بھی انکار کرے لیکن اُس کا بھیانک وجود ہے ضرور! شیخ ایاز کی نظم ''ماں! وہ مجھے کالی کر کے ماریں گے'' کو چاہے شاعر کے ذہن کی اختراع کہا جائے لیکن مدیجی تعلقہ کی بخت آور اور پچھلے مہینے شاہ پور چاکر کی کامل شاہ کالونی میں اپنے شوہر کے ہاتھوں کلہاڑی کا نشانہ بننے والے سولہ سالہ شاہ خاتون اور اس کی تیرہ سالہ نند آمنہ کس کھاتے میں موت کا لقمہ بنیں؟ کیا یہ سماج کی کٹھورتا نہیں کہ راہ چلتے ہوئے کوئی اَن جان جنازہ دیکھ کر کلمے پڑھنے اور تابوت کو کاندھا دینے والوں کے دیس میں میں جب شاہ خاتون اور آمنہ کے جنازے اُٹھے تو نہ اُنہیں کفن پہنائے گئے اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ عربستان کے حسین ابن علیؓ کی شہادت اور زینب کے کرب پر پندرہ سو سال سے ماتمی لوگوں کے دیس میں کیا ایک بھی ایسی آنکھ نہیں بچی تھی جو ان کی موت پر آنسو بہائے!

لیکن آوارہ گرد کے دیس کی بدنصیبی تو یہ ہے کہ دو مرتبہ وفاقی وزیر ہونے والے، بیرون ملک سے تعلیم حاصل کرنے والے اور اپنے آپ کو روشن خیال اور انسان دوست ذوالفقار علی بھٹو کا شاگرد کہلانے والے میر ہزار خان بجارانی کہتے ہیں کہ'' کاروکاری ایک انتہائی پرانی قبائلی رسم ہے۔ ہاں، یہ ہے کہ کچھ لوگ کبھی کبھار اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن کاروکاری کو معاف نہیں کیا جاسکتا اور ان کا جرم ثابت ہونے پر انہیں ختم کرنا ضروری ہے۔''

اب اس ''پڑھے لکھے'' شخص کو کون بتائے کہ عورتیں بھی انسان ہیں اور انہیں بھی اپنی مرضی سے زندگی کا راستہ اختیار کرنا تو کیا بلکہ اپنی مرضی کا جیون ساتھی چننے کا بھی حق ہے۔ یہ حق حاصل کرنے کے لیے انہیں کسی پیر، میر یا مرشد کی آشیرواد کی ضرورت نہیں۔ آوارہ گرد کی نظر میں وہ تمام عورتیں جو کلہاڑی کے زد میں بھی دل کی پکار پر گھر کی دہلیز پھلانگتی ہیں حقیقی سورما ہیں

لیکن آوارہ گرد کے دیس میں عورت کو مٹّی کے کھلونے سے زیادہ نہ سمجھنے والی نفسیات کا کیا کیا جائے؟ یہ کوئی آوارہ گرد کا سماج پر الزام نہیں بلکہ ایک سردار کا اپنے دوست کو کہا ہوا جملہ ہے کہ ’’تمہاری عورتیں سونے کی بنی ہوئی ہوسکتی ہیں، جنہیں کئی ایک مرتبہ استعمال کرنے کے بعد دھو کر مجسموں کی طرح سجا کر رکھ سکتے ہو لیکن ہماری عورتیں گیلی مٹّی کی بنی ہوئی ہیں اور استعمال کرنے پر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔‘‘

جس دیس میں عورت کو انسان نہیں بلکہ مجسمہ یا مٹّی کا کھلونا سمجھا جاتا ہے وہاں چارلس نیپئر کے اس پیغمبرانہ حکم پر کون عمل کرے گا کہ ’’سندھ کے باشندو! تم جس بے دردی اور سنگ دلی سے اپنی عورتوں کو قتل کرتے ہو، اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ افسوس کہ تم اپنی عورتوں پر اتنا بھی رحم نہیں کھاتے جتنا بھیڑ بکریوں پر کیا جاتا ہے۔ سندھ میں کاروکاری کی اذیت ناک اور انسان کش روایت انسانیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے، جسے میں کبھی بھی دیکھنا پسند اور گوارا نہیں کروں گا۔ میرے حکم پر بغیر کسی تاخیر کے ایک دم عمل ہونا چاہیے کہ کبھی بھی کسی سندھی عورت کے قتل کا واقعہ نہ سنوں۔ خبردار اگر آج کے بعد تم میں سے کسی نے سندھی عورت پر ہاتھ اُٹھایا تو وہ ہاتھ شانے سے کاٹ دوں گا۔‘‘

اب چارلس نیپئر کون بتائے کہ اس کے حکم کو سندھ کے باسیوں نے نہیں مانا ہے اور صرف ۱۹۹۴ء کے ایک سال میں ۲۲۳ عورتوں کو کاری کہہ کر قتل کیا گیا ہے۔ اُسے یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ سندھ دوست انگریز منتظم جان جیکب کے نام پر قائم ضلع جیک آباد میں ہر ماہ ایک سو سے زائد خواتین کاروکاری کے الزام کے تحت موت کا نوالہ بنتی ہیں۔

آوارہ گرد کو اُس وقت اپنے دانش وروں کے ذہنی دیوالیہ پن کا ادراک ہوا جب ایک دانش ور نے اپنے اخباری کالم میں لکھا کہ انسانی حقوق کے ادارے اور ذرائع ابلاغ سندھ میں عورتوں سے زیادتی کے متعلق خواہ مخواہ شوروغل کر رہے ہیں جب کہ یہ سب کچھ سندھ میں نہیں بلکہ دوسرے علاقوں میں ہوتا ہے۔ اب اس دانش ور کو کون بتائے کہ لکھی غلام شاہ کے قریب ’’کاریوں کا قبرستان‘‘ کی ہزاروں بے نام قبریں آہ وبکا کرتی ہیں کہ ’’ہے کوئی جو ہماری مدد کو پہنچے۔‘‘ لیکن انہیں کون بتائے کہ آوارہ گرد کے دیس میں کسی مرزا نرادی کی انگلی پکڑ کر جذباتی ڈائیلاگ بولنے والا مرد تو قومی شاعر اور قومی علامت ہوسکتا ہے لیکن عورت...... ’’ہوں‘‘ اس کی کیا حیثیت۔!‘‘

اٹھارویں صدی سے قائم کاریوں کا یہ قبرستان آوارہ گرد سمیت ان تمام لوگوں کے منھ پر زوردار طمانچہ ہے جو انسانی حقوق کی بات تو کرتے ہیں لیکن ان کی خلاف ورزیوں کو روکنے سے قاصر ہیں۔

آوارہ گرد چانڈکا میڈیکل کالج کی آخری سال کی طالبہ تسنیم مہر کے سامنے بھی گردن نہیں اُٹھا سکتا جس کی مہر قبیلے سے باہر منگنی کی گئی تو مہر قبیلے کے لوگوں نے یہ رشتہ توڑنے کے لیے اس کے والدین پر دباؤ ڈالا کیوں کہ ان کے مرحوم سردار کا ''فرمان'' تھا کہ مہر قبیلے میں پیدا ہونے والی لڑکی کا غیروں میں بیاہ کرنے والوں کو ان کی بیٹی سمیت قتل کیا جائے گا۔ جب تسنیم کے والدین نے اپنی بات کو مان دینا چاہا تو ایک دن مسلح افراد نے ان کے گھر پر حملہ کر کے تسنیم کی ماں کو قتل کر دیا جب کہ ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگنے کی وجہ سے تسنیم ہمیشہ کے لیے اپاہج ہوگئی۔

آوارہ گرد سوچتا ہے کہ کیا ایسی کارروائی کرنے والوں کے سردار کو اپنے پارٹی ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا رکن بنوانے والی وزیر اعظم کو قاہرہ اور بیجنگ میں عورتوں کے حقوق کی کانفرنسوں میں بولنے کا حق بھی ہے؟ بات آوارہ گرد کے ایک دوست کی بھی درست ہے کہ سچ بولنا کوئی بڑی بات نہیں دراصل بڑی بات سچ سننا اور سچ پر عمل کرنا ہے لیکن اُسے کون بتائے کہ ہمارے ہی سماج کے لیے کسی شاعر نے کہا تھا کہ ''سچ اچھا پر کوئی اور کہے تو اور بھی اچھا۔''

☆......☆......☆

# دھرتی کے دو مرجھائے ہوئے پھول

انگریزی کے کسی شاعر کو تو اپریل کا مہینہ کرب بھرا لگتا ہے جس میں سب کچھ پت جھڑ کی طرح جھڑ جاتا ہے لیکن آوارہ گرد کے دیس میں اس سال کیلنڈر شاید اپنی گنتی بھول گیا ہے اور اپریل سے ایک مہینہ قبل ہی اس دھرتی کے دو پھول غنی خان اور رضیہ بھٹی مرجھا گئے ہیں۔ جوانی کے ایام میں پشتو رسالے ''پشتون'' میں ''پاگل فلسفی'' کے قلمی نام سے خانوں اور سرداروں کے خلاف لکھ کر اپنے ماموں کی دشمنی مول لینے اور بیاسی سال کی عمر میں ویو پوائنٹ کو انٹرویو دے کر اپنے بھائی ولی خان اور بھاوج نسیم ولی خان کا غصہ برداشت کرنے والے غنی خان اور جنرل ضیاء، الطاف حسین، سردار نوتیزئی اور کمال اظفر کی دھمکیاں اور نوٹس کو ہمت سے سامنا کرنے والی رضیہ بھٹی کی اموات کا سبب آوارہ گرد کی رائے میں اٹھاسی اور باون سال کی عمریں نہیں بلکہ سماج میں موجود زیادتیوں اور نا انصافیوں کی جانب حساسیت کا برتاؤ اختیار کرنا ہے۔ کسی کا شعر ہے کہ:

گر آپ ہیں شہر کے قاضی تو گزارش سن لیں
میں ہوں حسّاس مری عمر گھٹا دی جائے

سو، آوارہ گرد کے بدنصیب دیس سے مزید دو حساس لوگ وہاں نقل مکانی کر گئے جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا۔

سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خان کے بڑے فرزند غنی خان کے لیے مشہور ہے کہ وہ اپنے والد کے کہنے پر رابندر ناتھ ٹیگور کی شانتی نکیتن چھوڑ کر انگلینڈ سے شگر انجینئر بن کر ایک شگر مل میں ملازم تو ہوئے لیکن اُن کا عشق فن کے ساتھ ہی رہا۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی طلبہ تنظیم میں کام کرتے ہوئے اُسے کئی ایسے پٹھان تنظیمی ساتھی ملے جو خان غفار خان اور ولی خان کے تو سخت نقاد تھے لیکن غنی خان اُن کے لیے ایسے تھے جس طرح سندھی نوجوانوں کے لیے تا حال بھٹائی اور دس پندرہ سال قبل تک شیخ ایاز۔

آوارہ گرد نے کہیں پڑھا تھا کہ عشق دراصل کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ خود اپنے ذہن میں تراشے ہوئے تصور یا بُت کے ساتھ ہوتا ہے۔ بیرونی دنیا کے افراد تو بس اُس کا عکس ہوتے ہیں۔ غنی خان اور پندرہ سال پہلے کے شیخ ایاز بھی نوجوانوں کی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اپنی لڑائی کے ترجمان کی طرح تھے۔ غنی خان سے متعلق یہ پڑھتے ہوئے کہ ٹیگور کی شانتی نکیتن میں پڑھنے کے دوران وہ ایک مرتبہ اندرا گاندھی کے ساتھ دہلی میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے لیکن طویل تقریروں سے بیزار ہو کر سو گئے، آوارہ گرد کو مخدوم محی الدین یاد آ رہے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس کے دوران وہ اکثر پیشاب کا بہانہ کر کے اجلاس سے اُٹھ کر شاعری کیا کرتے تھے۔

''سابقہ'' انقلابی شیخ ایاز کی اس بات سے تو آوارہ گرد کو کوئی اختلاف نہیں کہ شاعر انقلابی سے زیادہ اہم ہوتے ہیں لیکن جب شاعر کی آدرشی دنیا بھی دیوار برلن کے ساتھ ڈھے جائے اور شاعر اپنے ماضی پر سات لعنتیں بھیجے تو ایسا شاعر آوارہ گرد کی رائے میں غنی خان کا نہیں بلکہ سولزے نستن کا ساتھی ہے جو ۱۹۹۶ء میں بھی روسیوں کو ۱۹۱۵ء کی چرچ اور بادشاہت کا وفادار دیکھنا چاہتا ہے اور ناکامی پر اپنے out-dated ہونے کا ادراک کرنے کے بجائے عوام کو گالیوں سے نوازتا ہے۔

غنی خان سے متعلق سوچتے ہوئے آوارہ گرد کو اپنی زبان کا ''سب سے بڑا'' زندہ شاعر ذہنی طور پر انتہائی چھوٹا لگا۔ غنی خان نے تو افغان حکومت کی جانب سے کھیت کھلیان، انگوری باغوں اور دوسرے مال متاع کے جلوے پر افغانستان میں رہائش پذیر ہونے کی پیش کش ٹھکرا کر اپنے لوگوں اور اپنی دھرتی پر بیمار ہو کر سرکاری اسپتال میں علاج کراتے ہوئے بھی رہنا قبول کیا لیکن سندھی کا شاعر ''اے بے قدر دھرتی! لعنت ہو تم پر'' جیسی بات کرتا ہے۔ اب اس شاعر کو

کون بتائے کہ دھرتی اپنے چاہنے والوں کے لیے پیار اور ''خدمات'' کی قیمت چکانے والوں کے لیے دھتکار اور Very Sorry کا سائن بورڈ رکھتی ہے۔

مارچ کے مہینے کا دوسرا شکار بننے والی رضیہ بھٹی انگریزی جریدے نیوز لائن کی ایڈیٹر تو تھیں لیکن آوارہ گرد کی نظر میں وہ نہ صرف نیوز لائن بلکہ تمام باضمیر صحافیوں کے لیے سائبان تھیں۔ سائبان ہٹنے کے بعد بھی ''نیوز لائن'' کراچی کے راستوں سے گند کچرا اٹھا کر پیٹ کی دوزخ کی آگ بجھانے والوں اور سماجی ترقی کے ہاتھوں وجود گنوانے والے شکاریوں کے کرب اور داستانوں کو نہ جانے پیش کرتا رہے گا یا......!

آوارہ گرد کو ۱۹۹۰ء کا وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب کراچی میں لاکھوں افراد کے جلسے کو انگلی کی جنبش سے خاموش کرانے والے ''ان داتا'' نے ایک جلسے میں ''نیوز لائن'' کے لیے نامناسب لفظ استعمال کرتے ہوئے نیوز لائن کے عملے کو دھمکیاں دیں۔ نیوز لائن کے دفتر کے قریب ہی منعقدہ اس جلسہ گاہ میں موجود دوسرے لوگوں نے تو نہ جانے کیا محسوس کیا تھا لیکن سندھی اخباروں میں کام کرنے اور مالکان یا ایڈیٹروں کی جانب سے کسی طاقت ور شخص کے خلاف نہ لکھنے کے حکم نامے سننے والے آوارہ گرد نے یہ ضرور سوچا تھا کہ اب نہ صرف نیوز لائن شایع نہیں ہوگا بلکہ شہر سے کئی جواں ذہن صحافیوں کے جنازے بھی اٹھیں گے لیکن آوارہ گرد کو اُس وقت شدید حیرت ہوئی جب اُس جلسے کے دوسرے ہی دن اُس نے نیوز لائن فون کیا تو نہ صرف اُس کا ڈرپوک صحافی دوست موجود تھا بلکہ وہاں کام کرنے والی خواتین بھی اپنی ''ہائے اللہ'' اور قہقہوں کے ساتھ موجود تھیں۔

آوارہ گرد سمجھتا ہے کہ کسی بھی ادارے کے گردن تان کر چلنے کا زیادہ تر دارو مدار اس کے کارکنوں کی ہمت کے ساتھ ساتھ اس کے سربراہ کے حوصلے پر بھی ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایم کیو ایم کے دباؤ پر ''ڈان'' اخبار کچھ دنوں تک بند نہیں ہوتا اور الطاف حسین اور کمال اظفر کی جانب سے لال پیلی آنکھیں کرنے پر بھی نیوز لائن کی اشاعت جاری نہ رہتی۔ آوارہ گرد کی رائے میں کاروکاری پر شایع ہونے والی ٹائیٹل اسٹوری میں جتنا حصہ اس کی مصنفہ نفیسہ شاہ کا تھا اُتنا ہی کمال رضیہ بھٹی کا بھی تھا، ورنہ سندھی اخبارات میں کسی سخت تحریر کو انچارج، مالک یا ایڈیٹر زبردستی رکواتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ایک سندھی اخبار کا دانش ور ایڈیٹر اپنے اداریے میں سندھی صحافت کو انگریزی صحافت سے کم نہ گردانتے ہوں لیکن یہ بات تو بہ ہرحال طے شدہ

ہے کہ انگریزی میڈیا بالخصوص فرنٹیئر پوسٹ، ویو پوائنٹ، فرائیڈے ٹائمس، ہیرالڈ اور نیوز لائن نے جنرل ضیاء کے مارشل لا سے لے کر اب تک جو کردار نبھایا ہے وہ سندھی صحافت سے بس سردار مظہر علی خان، رضیہ بھٹی، خالد احمد اور شیری رحمان جیسے ایک درجن کے قریب ایڈیٹروں کے فاصلے پر ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ آوارہ گرد کی زبان بولنے والے اور انگریزی پڑھ سکنے والے انگریزی میڈیا کو اُس وقت تو اپنا سمجھتے ہیں جب وہ خود کسی جبر کے شکار ہوں لیکن جب کوئی اور تشدّد کا نشانہ بن رہا ہو تو اُن کے لیے آواز بلند کرنے والے اخبار، رسالے، HRCP اور ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسے ادارے دشمن کے ایجنٹ بن جاتے ہیں۔

غنی خان اور رضیہ بھٹی پر لکھتے ہوئے آوارہ گرد کو ایڈز کی بیماری میں ہلاک ہونے والے امریکہ کے ایک سیاہ فام فلمی اداکار کی یاد آ رہی ہے جس نے مرنے سے کچھ دن قبل کہا تھا کہ امریکہ میں ایڈز کا مریض ہو کر مرنے سے زیادہ کرب انگیز بات سیاہ چمڑی کے ساتھ جینا ہے۔ آوارہ گرد کے دیس میں تو ایڈز کا مریض ہو کر مرنے یا سیاہ چمڑی کے ساتھ جینے سے بھی زیادہ کرب انگیز بات حساس دل اور سوچنے والے ذہن کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ اس کے دیس میں بھی کوئی ایسا دن آئے کہ شاعر ''لاشے ہوا میں جھولتے ہیں'' اور ''پھریرے لہراؤ، نعرے لگاؤ، لڑتے چلو، بڑھتے چلو'' جیسی شاعری کرتے ہوئے جیل نہ جائیں بلکہ تتلیاں پکڑنے والے بچوں، پریم کتھاؤں، پھولوں اور پنچھیوں کے گیت گائیں اور صحافی اتنے مرے، اتنے گرفتار ہوئے اور اتنے گھائل ہوئے جیسی خبریں بنانے اور اختلاف رائے رکھنے پر سرکاری اور غیر سرکاری جبر کا شکار بننے کے بجائے قراقرم اور کھیرتھر پر برف باری ہونے اور تھر اور چولستان میں بارش ہونے پر پھول اور ہریالی کھلنے جیسی خبریں بنائیں۔

☆......☆......☆

# پی ایم اے ہاؤس کی عجب دنیا

پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے لگاتار ساتویں سال بھی با مقصد واک اور دوڑ (Walk a Cause and Marathon) منعقد کرائی۔ صبح جلدی نیند سے نہ اٹھنے والی اپنی عادت پر فخر کرنے والا آوارہ گرد بھی اُس دن علی الصبح امن اور ماحول کی بہتری کے نعروں کے تحت ہونے والی اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ چار کلو میٹر کی واک کے دوران پی ایم اے ہاؤس سے جناح کے مزار تک پورا بندر روڈ خواتین، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی بھی تھکاوٹ کی پرچھائیں ظاہر نہ کرنے والے ان چہروں پر آوارہ گرد کو شہر میں امن کی واپسی کے لیے فقیروں کے کشکول نظر آئے۔ یہ چہرے جیسے کہہ رہے ہوں کہ اس شہر کو امن لوٹا دو کہ یہاں کے باشندے راتوں کو اتنی آوارہ گردی کریں کہ چھٹی کے دن کو کیا کام کاج کے دنوں میں بھی دیر تک سوتے رہیں۔

پی ایم اے ہاؤس کی دنیا بھی عجیب ہے۔ ویسے تو یہ ڈاکٹروں کی پیشہ ور تنظیم کا ٹھکانہ ہے لیکن آوارہ گرد نے اسے عام سماج کے اُتار چڑھاؤ سے کبھی بھی کٹا ہوا نہیں دیکھا ہے۔ جنرل ضیا کے مارشل لا میں جب ہر ایک اپنی کھال بچانے کے چکر میں تھا تو کراچی میں پریس کلب اور پی ایم ہاؤس ہی مارشل لا مخالفین کے لیے ہائیڈ پارک بنے ہوئے تھے۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی تحریک کے شہدا کو بھی پی ایم اے ہاؤس میں یاد کیا گیا تو ”تشدد

کے خلاف آواز'' نامی تنظیم کا تاسیسی پروگرام بھی وہیں ہوا تھا۔

ویسے تو آوارہ گرد کے دیس کے اکثر ڈاکٹر پیسے کمانے یا اس ''پس ماندہ'' ملک سے جان چھڑا کر، بیرون ملک جانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں لیکن پی ایم اے ہاؤس میں مستقل بنیادوں پر آنے والے ڈاکٹروں کو آوارہ گرد نے پیسے کمانے کے بجائے مفلس اور بے بس لوگوں کے علاج معالجہ کے امکانات پیدا کرنے اور پس ماندہ ملک کو چھوڑ کر ترقی یافتہ دنیا کو جانے کے بجائے اس دیس کو ہی بہتر بنانے کے لیے تگ و دو کرتے یا سوچتے ہوئے دیکھا ہے۔

آوارہ گرد کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ اصل بات علم یا جان کاری حاصل کرنے یا اس کا ماہر ہونا نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کو اپنے جیسے انسانوں کی بہتری کے لیے استعمال کرنا ہے۔

پی ایم اے ہاؤس میں آوارہ گرد نے ڈاکٹر ٹیپو سلطان کو بھی دیکھا ہے جو پرائیوٹ پریکٹس کے ذریعے پیسے کمانے سے زیادہ وقت غریبوں کے علاج کے لیے بھاگ دوڑ میں گزارتے ہیں۔ سول اسپتال کراچی میں اُن کا وارڈ ان چند سرکاری وارڈوں میں سے ایک ہے جہاں جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہاں مریض کو مارنے کے بجائے ہر ممکن حد تک اُسے بچانے کی کوشش ہوتی ہے۔ آوارہ گرد کو یاد آ رہا ہے کہ کچھ مہینے قبل ڈاکٹر ٹیپو سلطان نے اپنے وارڈ میں داخل ایک لاعلاج بچی سے متعلق بتاتے ہوئے کہا تھا کہ'' اس بچی کے علاج کے دوران عزرائیل اور ڈاکٹروں کے درمیان دوڑ ہے، دیکھیں کون جیتتا ہے۔'' اُس دن آوارہ گرد نے کہا تھا کہ اس مرتبہ ہر صورت میں عزرائیل کو ہی شکست ہونی چاہیے اور یہ لڑکی ڈاکٹر ٹیپو اور ان کی ٹیم کی کوششوں سے صحت یاب ہو کر اب اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ اسکول جانے لگی ہے۔

آوارہ گرد کے دیس میں جہاں ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں آپریشن کے دوران پیسے طلب کرتے ہوں اور پیسے نہ ملنے کی صورت میں مریض کو آپریشن ٹیبل پر ہی آپریشن مکمل کیے بغیر چھوڑ دینے کی دھمکی دی جاتی ہو وہاں ٹیپو سلطان اور ان کے وارڈ کے ڈاکٹر اس غریب والدین کی مریض بیٹی کے لیے امریکہ سے انجکشن منگوانے کے لیے ہاتھ پیر ماریں تو یہ بات کم از کم آوارہ گرد کے لیے حیرت انگیز ضرور ہے۔

آوارہ گرد پی۔ ایم۔ اے ہاؤس میں آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر ادریس ایدھی سے بھی ملا ہے جو کراچی کے کاٹھیا واڑی میمن ہونے کے باوجود پیسے کمانے کے بجائے اپنی صلاحیتیں اور علم

ممکن حد تک عام لوگوں کی بہتری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ادریس کے ہمدردانہ رویہ رکھنے کا بہت سارے لوگوں کو پتہ لگ گیا ہے اور وہ اکثر علاج معالجہ کرانے کے بعد پیسے نہ ہونے کا عذر کر کے اُن سے رعائتیں حاصل کرتے ہیں۔ آوارہ گرد کے ساتھ اکثر اوقات سندھ کے دور دراز علاقوں میں علاج معالجے کی سہولیات نہ ہونے کا دکھڑا رونے والے ادریس ایدھی کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ دو سال قبل انہوں نے جب بلوچستان اور سندھ کے صوبوں میں آنکھ کا کوئی انتہائی باریک آپریشن کرنے والے اپنے واحد سرکاری وارڈ کے لیے محکمۂ صحت سے مطلوبہ سامان مانگا تو اُس کا جواب ہی نہیں ملا۔ آوارہ گرد کو اکثر حیرت ہوتی ہے کہ آنکھوں کے آپریشن میں ''آرٹسٹ'' کہلانے والے ادریس ایدھی اتنے غیر دوستانہ رویہّ کے باوجود ابھی تک آوارہ گرد کے دیس پر تین لعنتیں بھیج کر یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے لیکن شاید انہوں نے بھی راجکپور کی فلم میرا نام جوکر کا گانا ''جینا یہاں مرنا یہاں، اس کے سوا جانا کہاں'' نہ صرف سنا ہے بلکہ اِسے اپنی زندگی کا مقصد بھی بنالیا ہے۔

ایسا ہی رویہّ کان، ناک اور حلق کے نوجوان ماہر ڈاکٹر علیم قادر کا بھی ہوتا ہے جو برطانیہ میں اپنے ڈاکٹر باس کو یہ کہہ کر وطن لوٹ آئے تھے کہ وہ کسی ''فرسٹ کلاس ملک کے تھرڈ کلاس شہری بن کر رہنے پر اپنے تھرڈ کلاس ملک کے فرسٹ کلاس شہری'' بن کر رہنے کو ترجیح دیں گے۔ آوارہ گرد نے اپنی زندگی میں کسی دوسرے کے لیے اتنا خوش کم ہی لوگوں کو دیکھا ہے جتنا علیم اُس دن تھا جب اُس نے ایک چھوٹی بچیّ کے گلے کے کسی ایسے مرض کا بغیر پیسوں آپریشن کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی گردن بھی نہیں ہلاسکتی تھی۔

ان ڈاکٹروں اور ان کی سرگرمیوں کا رہبر و رہنما، ہمیشہ برق کی طرح متحرّک رہنے والا ڈاکٹر شیر شاہ ہے جو آوارہ گرد کو اکثر الہ دین کا جن لگتا ہے کیوں کہ اُس نے شیر شاہ کو کبھی فارغ بیٹھے نہیں دیکھا ہے، اگر اُس کے پاس کوئی کام نہیں ہوگا تو اپنے لیے کام پیدا کرے گا۔ آئرلینڈ سے خواتین کے مخصوص امراض اور بالخصوص ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے میں مہارت حاصل کرنے کے بعد جب اپنے دیس میں شیر شاہ نے دیکھا کہ بانجھ عورتوں اور مردوں کے بچےّ پیدا کرنا تو بعد کی بات ہے یہاں تو زچگی کے دوران عورتوں کی اموات کی شرح دنیا کی سب سے زیادہ تعداد والے ممالک میں شامل ہے، تو تیسری دنیا میں عورتوں کے امراض کی مطالعہ کے لیے پاکستان سے بھی زیادہ بد حال ملک ایتھوپیا میں تربیت لینے اور وہاں سے واپس آکر ڈاؤ

میڈیکل کالج اور سول اسپتال کی بغیر کسی کام والی آسان ملازمت چھوڑ کر کے ایم سی کا غریب بستی میں قائم ایک اسپتال جا کر بسایا جہاں اکثر راتوں کو بھی اپنی نیند خراب کر کے اسپتال جا کر آپریشن کرنا پڑتا ہے۔

آوارہ گرد کو پچھلے سال گرمیوں کی تپتی دھوپ میں شمالی سندھ کے راستوں پر شیر شاہ کے ساتھ کیا ہوا سفر کبھی نہیں بھولے گا جب نکسیر پھوٹنے کے باوجود اُس نے نوجوان ڈاکٹروں کو لیکچر دینے کا اپنا پروگرام تبدیل نہیں کیا۔ شیر شاہ سے متعلق اس کے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر نے تو آوارہ گرد کو یہ کہا تھا کہ "یہ بیوقوف ہے جو صبح شام غریبوں کے پیچھے خوار رہتا ہے۔ اگر اپنی پرائیوٹ پریکٹس پر توجہ دے تو ملیر کے بجائے ڈیفنس یا کلفٹن میں رہ رہا ہوتا!" لیکن اس بیوقوفی پر آوارہ گرد شیر شاہ اور ان کے ساتھیوں کو اپنی لغت کا سبب سے بڑا خراج تحسین پیش کرنے کے سوا نہیں رہ سکتا۔

آوارہ گرد کی بس اتنی ہی خواہش ہے کہ اس کا دیس بھی انسانی صحت اور اقدار سے متعلق عالمی اداروں میں پیش ہونے والے اعدادوشمار میں مثبت انداز کے لیے درج ہونہ کہ حالیہ دنوں کی طرح پس ماندہ ہونے کی وجہ سے۔ اس کی جان پہچان والے ڈاکٹر امراض اور ان کی وجہ سے ہونے والے جانی نقصان کے دل دہلانے والے اعدادوشمار پیش کرنے کے بجائے طب اور صحت میں اپنی صلاحیتوں کے کارنامے بیان کرتے رہیں۔

☆......☆......☆

# روشن نینوں کے مرجھائے ہوئے سپنے

فیصل آباد کی ڈاکٹر الطاف بشیر اپنے گھر میں نامعلوم مسلح افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئیں۔ گولیوں کا نشانہ بننا یا خود زندگی بچانے والے ڈاکٹروں کو زبردستی موت کی نیند سلانا آوارہ گرد کے دیس میں اَن ہونی بات نہیں رہی لیکن فیصل آباد میڈیکل کالج کی سابقہ پرنسپل ڈاکٹر الطاف بشیر کے قتل کا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ روائیتی ڈاکٹروں کی طرح صرف اپنی پرائیوٹ پریکٹس پر دھیان دینے کے بجائے فیصل آباد میں ''زچہ و بچہ پروجیکٹ'' چلا رہی تھیں۔ آوارہ گرد کے دیس میں جہاں ہر ایک دوسروں کا گھر جلا کر اپنی دیوالی کرنے کے چکر میں ہے، وہاں ڈاکٹر الطاف بشیر ان چند لوگوں میں سے تھیں جو اپنی پوری ایمان داری اور قوت کے ساتھ محروم لوگوں کی بھلائی اور نجات کے لیے تگ ودو کرتے ہیں۔ اگر چہ ڈاکٹر الطاف بشیر کے شوہر (جو خود بھی ڈاکٹر ہیں) نے حال ہی میں آوارہ گرد کو اعتماد سے بتایا کہ ڈاکٹر الطاف کے بعد بھی ان کا پراجیکٹ جوں کا توں چلتا رہے گا تاہم ایک بات تو طے ہے کہ بقول کچھ لوگوں کے، اس پراجیکٹ سے ڈاکٹر الطاف بشیر کو عشق تھا اور عشق کی منزل طے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

آوارہ گرد کے بدنصیب دیس نے کبھی بھی اپنے خیر خواہ سماجی کارکنوں کو برداشت نہیں کیا اور بات فقط ڈاکٹر الطاف بشیر پر ہی ختم نہیں ہوتی۔ ایدھی کو کبھی خیرات میں ملنے والی

کھالوں سے محروم کیا جاتا ہے تو کبھی پاسپورٹ جاری ہونے سے قبل اسے پولیس انکوائری کرانے کو کہا جاتا ہے۔ بدر ابڑو چاہے یہ لکھے کہ عام لوگوں کو جب پولیس انکوائری کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ایدھی کوئی آسمان سے تو نہیں اترا۔ لیکن آوارہ گرد کی رائے میں ایدھی ایسا شخص ہے جو اگر آوارہ گرد اور بدر ابڑو جیسے ایک لاکھ افراد دے کر بھی حاصل کیا جائے تو سودا مہنگا نہیں! لیکن اس میں قصور بدر ابڑو کا بھی نہیں، یہ آوارہ گرد کے معاشرے کی عمومی نفسیات ہے جو کبھی اخباری رپورٹوں اور اداریوں میں ظاہر ہوتی ہے تو کبھی مسکین جھان خان کھوسو کے خلاف ڈی پی آر حکم نامے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔

اور وہ تیس سالہ انجینئر سید ناصر حسن جو بلوچستان کی بے آب دھرتی کو پانی سے سیراب کرنے کے سپنے دیکھنے پر ۱۹۷۴ء میں قلات میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا۔ یہ بات آوارہ گرد کی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے اس سے امریکہ میں انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بجائے بلوچستان کی ٹھوس دھرتی کے لیے یہ کہلوایا ''یہ وہ دھرتی ہے جس سے مجھے پیار ہے۔ یہیں میں مرنا چاہوں گا۔ اگر یہاں ہم پر حملہ ہوتا ہے تو مجھے زیاں کا کوئی احساس نہیں ہوگا کیوں کہ میں اپنی زندگی اس دھرتی اور یہاں کے لوگوں کے لیے ارپن کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ الفاظ ناصر نے خود پر ہونے والے حملے سے کوئی لمحہ بھر قبل اپنی انگریز ساتھی سے کہے تھے۔

آوارہ گرد نے منٹو کی کسی تحریر میں پڑھا ہے کہ تقسیم کے وقت جب لاہور کے باسی ''کافروں'' کی نشانیاں مٹا رہے تھے تو اس دوران سر گنگا رام کا مجسمہ گراتے ہوئے کچھ لوگ زخمی ہوئے تو انہیں علاج معالجہ کے لیے گنگا رام اسپتال ہی منتقل کیا گیا۔

آوارہ گرد سوچتا ہے کہ کیا یہ ریت اس کے سماج میں برقرار رہنے کے لیے ہے کہ جب پارٹی رہنما زخمی ہوں تو ایدھی ایمبولینس ہی انہیں اسپتال لائے اور ان کی لاشیں آبائی گاؤں پہنچائے، اور جب ایدھی کو پاسپورٹ کی ضرورت ہو تو کہا جائے کہ ہم اس انگریزی نہ بولنے اور ملیشیا کے کپڑے پہنے داڑھی والے شخص کو پہچانتے ہی نہیں اور وہ میٹھا در تھانے سے پولیس انکوائری کرا کے آئے! حیف ہے ایسے ملک اور اس کے چلانے والوں پر! اور وہ فیصل آباد کی غریب بستی میں بچوں کو پڑھانے کے سپنے دیکھنے والا شاعر نعمت احمر کیا صرف اس لیے تھا کہ کوئی جنونی مذہب کے نام پر اُس کے سینے میں چھرا گھونپ کر اس کی سانس کی ڈوری کاٹ دے۔

آوارہ گرد کو اپنی شعوری زندگی میں حاصل ہونے والے مشاہدات اور تجربات کے بعد

بچپن میں پڑھائے اور سکھائے گئے وہ تمام سبق فضول لگتے ہیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ یسوعؑ بیماروں وہ بھی جذام کے مریضوں کو شفا دے کر مسیح بنے اور حضرت محمدؐ بیمار یہودن کی بھی عیادت کرنے جاتے تھے، اسلام کی سربلندی کے لیے لڑی گئی جنگوں میں زخمیوں کو پانی پلانے والی خواتین دشمن کے زخمی سپاہیوں کو بھی تشنہ مرنے نہیں دیتی تھیں۔ کیا یہ سب کچھ اور فلورنس نائیٹ اینگل اور ہیلن کیلر کے سبق سال کے اختتام پر امتحانات میں نمبر لینے کے لیے تھے یا......

آوارہ گرد بس اتنا ہی چاہتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم اپنے مسیحاؤں کو اتنی عزت دیں کہ وہ نہ صرف یہ بدنصیب دیس چھوڑ جانے کا نہ سوچیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک ٹیگور کے الفاظ کے عملی اظہار کے طور پر ایدھی، اختر حمید خان اور ادیب رضوی جیسے سورج دیے کا جیسا متبادل ہی بنے!

☆......☆......☆

# فلسطین، ریگل چوک اور یہودی کی لڑکی

فلسطین میں انتخابات ہوئے اور یاسر عرفات سمیت ان کے فتح گروپ کے امیدوار اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ جمہوریت کی صدی کہلانے والی بیسویں صدی کے آخری عشرے کے آخری برسوں میں انتخابات ہونے اور ان میں کسی کا کامیاب ہونا جمہوری ممالک کے لوگوں کے لیے تو ممکن ہے انہونی بات نہ ہو لیکن جمہوری حقوق سے محروم اور کسی طویل رات کی طرح پھیلی آمریت کے شکار لوگوں کے لیے یہ حیرت انگیز بات ضرور ہے۔

فلسطین کی خودمختاری کے لیے ہونے والے پہلے انتخابات کے بعد تو کوئی بھونچال نہیں آیا لیکن کئی سال فوجی آمریت کے شکار ارجنٹائن کے لوگوں کو جب ووٹ کی طاقت کے ذریعے فوجی آمر کو حمائیتوں کو شکست دینے کا موقع ملا تھا تو وہاں کے جمہوریت پسند شہریوں نے فتح کے جشن کے دوران ۱۴۲ فوجیوں کو قتل کر دیا تھا۔ آوارہ گرد کے ایک دوست کو جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے بعد ہونے والے پہلے عام انتخابات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا سو وہاں سے واپسی پر جذباتی ہو کر بتانے لگا تھا کہ صبح آٹھ بجے شروع ہونے والی پولنگ کے لیے لوگ صبح چار بجے سے ہی قطار میں کھڑے ہو گئے تھے اور اس دوست کے بقول سندھ کے شہریوں جیسے نیلسن مینڈیلا اور بنجمن مولائز کے دیس باسی اس دن تین کام کرتے رہے، ووٹ دیتے رہے، ناچتے رہے اور روتے رہے۔ آوارہ گرد کے اس دوست کے بقول اس نے ننانوے فی صد لوگوں کو

ووٹ دینے کی خوشی میں ہچکیاں مار کر روتے دیکھا تھا۔ خود آوارہ گرد کے دیس میں بھی جنرل ضیا کی گیارہ سالہ مارشل لائی آمریت کے دور میں جوان ہونے والی نسل نے ۱۹۸۸ء میں جب انہونی کو ہونی ہوتے دیکھ کر ووٹ دیے تو ان کے احساسات بھی جنوبی افریقہ میں ھاموں سے مختلف نہیں تھے۔

بات ہو رہی تھی فلسطین کے انتخابات کی، بظاہر تو کچھ برس قبل میڈرڈ میں شروع ہونے والے امن مذاکرات اس مرحلے پر جا پہنچے کہ عرفات کئی سال کے بعد مقبوضہ علاقوں میں داخل ہوئے اور اسرائیلی وزیر اعظم آئزک رابن کو توپ کے دہانے میں پنچھیوں کے گھونسلوں کے سپنے دیکھنے اور انہی کے لیے اپنے بدترین دشمن سے ہاتھ ملانے پر ایک ہم مذہب یہودی کے ہاتھوں کنپٹی پر گولی کھانی پڑی۔ آوارہ گرد کو یہ بات حیرت انگیز لگتی ہے کہ امن، جس کے سپنے کسی زمانے میں محمود درویش دیکھتا تھا، اب اس کے سابقہ دشمن اسرائیلی دیکھ رہے ہیں اور محمود درویش اور اس کے ہم خیال فلسطینی اسرائیل سے جنگ جاری رکھنے کی بات کر رہے ہیں۔

اسرائیل اور فلسطین کی لڑائی آوارہ گرد کے دیس والوں کے لیے تو جیسے اپنی لڑائی تھی۔ کمیونسٹ جارج حباش اور لیلیٰ خالد کے دیوانے تھے۔ تو عام لوگ اور دائیں بازو والے یاسر عرفات کو اپنا سورما سمجھتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں لیلیٰ خالد کے اسرائیلی جہاز اغوا کرنے کی باہمت کارروائی کے بعد کئی والدین نے اپنی بیٹیوں کے نام بھی لیلیٰ خالد رکھے۔

ویسے بھی ساٹھ اور ستّر کے عشرے انقلاب اور جہد و جہد کے عشرے تھے، ہر ایک ہو چی منہہ کا بیج لگائے، فیڈل کاسترو کی عدالتی تقریر، چے گویرا جیسی ٹوپی پہنے یا بولیویائی ڈائری ہاتھ میں اُٹھائے خود کو عالمی انقلاب کا حصہ سمجھتا تھا۔

لاہور کا افسانہ نگار سمیع آہوجہ، لاطینی امریکا کا پیٹرک، جرمنی کا بائیدر منصاف گروپ اور جاپان کی ریڈ آرمی کے ساتھ اس فلسطین کی جنگ لڑتے رہے جس کا بقول شخصے انہیں درست تلفظ بھی نہیں آتا تھا، (لاطینی امریکا کا پیٹرک تو جہاز اغوا کرنے کی کاروائی میں لیلیٰ خالد کے ساتھ تھا اور جہاز کے اندر ہی اسرائیلی کمانڈوز سے جھڑپ میں مارا گیا۔ آوارہ گرد کو یاد ہے کہ لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں سب سے زیادہ عوامی پذیرائی یاسر عرفات اور کرنل قذافی کو ہی ملی تھی۔

ایک زمانے میں فلسطین اور فلسطینی لوگوں کے احترام کا یہ حال تھا کہ اسّی کی دہائی کے

ابتدائی برسوں میں ایک طلبہ تنظیم نے جامشورو کیمپ میں اپنے سالانہ کنونشن کے دوران مخالف تنظیم کے حملے سے بچنے کے لیے فلسطین کے کراچی میں متعیّن قونصل جنرل کو دعوت دی تھی۔ فلسطین کی آڑ میں سیاسی کارکنوں کی ایک دوسری حرکت بھی آوارہ گرد کو یاد آ رہی ہے۔

۱۹۸۲ء میں جب پاکستان پر جنرل ضیا کے مارشل لا کے کوڑے برس رہے تھے ان دنوں اسرائیلی فوجیوں نے لبنان میں صابرہ اور شتیلا نامی فلسطینی پناہ گزین کیمپوں پر دھاوا بولا تو کراچی سمیت پورے ملک میں ضیا کے مخالفین نے یوم احتجاج منایا تھا۔ آوارہ گرد بھی کراچی میں ہونے والے ایک ایسے مظاہرے میں شریک ہوا تھا، جس پر پولیس نے لاٹھیوں اور آنسو گیس سے حملہ کیا تو پولیس اور کامریڈوں کی جھڑپیں شروع ہوگئی تھیں۔ یاد رہے کہ ۱۹۷۰ء میں جب اردن کے شاہ حسین نے عمان میں فلسطینیوں کا قتل عام کیا تھا تو جنرل ضیا بھی اس قتل عام میں پاکستانی فوج کے بریگیڈیئر کے طور پر شامل تھا۔ فلسطین کے کاز سے یک جہتی کے اظہار اور اس کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ایک کوشش مارشل لا دور میں جام صادق سازش کیس کے ملزمان نے بھی کی تھی جب انہوں نے فلسطین کے لیے اسرائیل سے جنگ کے واسطے لبنان جانے کی پیش کش کی تھی۔

آوارہ گرد کے دیس میں فلسطین کی جدو جہد پر کئی ایک فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ ان میں سے ریاض شاہد کی فلم ''زرقا'' نہ صرف بہترین تھی بلکہ یہ دنیا کی ان دو فلموں میں سے ایک ہے جو نامور سماجی کارکن عبدالستار ایدھی نے دیکھی ہیں۔ ریاض شاہد کے مکالمے اور ہدایت کاری، حبیب جالب کے نغمات اور نیلو، طالش اور علاؤ الدین کی شان دار اداکاری نے زرقا کو ایسی فلم بنا دیا کہ دیکھنے والوں نے اسے کئی ایک بار دیکھا اور کئی ایک والدین نے اپنی بیٹیوں کے نام ''زرقا'' بھی رکھے۔ زرقا فلم کے حوالے سے آوارہ گرد ایک اعتراف یہ بھی کردے کہ پانچ چھ مرتبہ یہ فلم دیکھنے کے باجود، وہ اس فلم کا وہ منظر دیکھ نہیں سکا ہے جس میں طالش سگار سے نیلو کا بازو داغتا ہے۔

آوارہ گرد کے دیس میں فلسطین سے تعلق رکھنے والی جس دوسری شخصیت نے نام کمایا ہے وہ حنان اشروی ہے۔ فلسطینی نسل کی یہ عیسائی خاتون اس وقت عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے سامنے آئی جب میڈرڈ مذاکرات کے دوران فلسطینی وفد کی ترجمان کے طور پر انہوں نے اسرائیل بلکہ صحافیوں کی فوج سے بھی جوانمردی سے ''مقابلہ'' کیا۔ حالیہ انتخابات میں آوارہ گرد

کے دیس نے حنان اشروی کے عیسائیوں کے لیے مخصوص ایک نشست سے کامیابی کی خبر پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے کارکن کے طور پر آوارہ گرد آنے والے دنوں میں اس بات کا منتظر ہوگا کہ حنان اشروی فلسطین میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، پر کس طرح آواز بلند کریں گی۔

آوارہ گرد کے دیس کے کئی ایک مصنفین نے فلسطین پر نظمیں اور افسانے بھی لکھے ہیں اور ہاں کئی ایک فلسطینی شعرا کی ترجمہ کی ہوئی پچاس کے قریب نظموں کا مسوّدہ پچھلے پانچ آٹھ سال سے سندھ کے ایک انتہائی بڑے علمی ادارے کے گودام کی زینت بنا ہوا ہے۔ کتابی صورت میں کسی فلسطینی کی کتاب ''ہم زندہ رہیں گے'' کے عنوان سے لیلیٰ خالد کی سوانح عمری سندھ میں بھی شائع ہوئی ہے۔ جہاں تک آوارہ گرد کی یادداشت ساتھ دیتی ہے تو اس کتاب کا اردو ترجمہ کشور ناہید نے اور سندھی ترجمہ زیب سندھی نے کیا تھا۔ آوارہ گرد کو یاد آیا کہ نجم عباسی نے اپنے افسانوں کے کسی مجموعے کا انتساب ''فلسطین اور سندھ کے ایک جیسے حالات کے حوالے سے یاسر عرفات کے نام'' بھی کیا تھا۔

آوارہ گرد کے ایک ہم وطن (فیض احمد فیض) کو تو یہ فخر بھی حاصل رہا ہے کہ وہ ادبی رسالے ''لوٹس'' کے ایڈیٹر بھی رہے آوارہ گرد کے ادبی ہم وطنوں نے محمود درویش، توفیق زیاد اور غسان کنفانی کو اپنی زبان کے کسی مصنف سے زیادہ عزّت دی ہے۔ آوارہ گرد کو اسرائیلی قبضے میں شہر میں مزاحمتی جنگ اور ادب میں مصروف رہتے ہوئے کئی سال میئر منتخب ہونے والے توفیق زیاد کی روڈ حادثے میں ہلاکت نے دکھی کردیا تھا۔ فلسطین کی خوداختیاری کے حوالے سے کسی اور شہر میں تقریب کا انتظام یاسر عرفات کے حوالے سے ہونے والی تقریب میں شرکت کے بعد واپسی پر ایک ٹرالر کی ٹکر کا شکار ہونے والے توفیق زیاد نے ایک ایسا مصرع ''بخش دوں گا اسے اپنی آدھی زندگی جولائے کسی روتے بچّے کے چہرے پر مسکراہٹ'' لکھا جس کے عملی روپ کے لیے آوارہ گرد آدھی تو کیا اپنی پوری زندگی دے سکتا ہے۔

پچھلے سال جب اسلام آباد میں مسلمان خواتین ارکان اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اخباری اطلاعات کے مطابق اس دوران سب سے زیادہ اہمیت لیلیٰ خالد کو ہی حاصل تھی۔ آوارہ گرد کو اپنے ماضی کی سورما خاتون نے اس وقت انتہائی مایوس کیا جب اس نے حماس کو بنیاد پرست تنظیم تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ عالمی انقلاب کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر گوریلا جدوجہد میں دیو

مالائی حیثیت حاصل کرنے والی لیلیٰ خالد نے مذہبی انتہا پسندی سے بھرپور حماس کو اپنا اتحادی کہا تو آوارہ گرد کو کسی کا کہا ہوا یہ جملہ شدت سے یاد آیا کہ ''گرنے والا گہرائی نہیں دیکھتا!''

آوارہ گرد کو کراچی میں پڑھنے والا وہ فلسطینی طالب علم یاد آ رہا ہے جو اسرائیلی قبضے میں کسی شہر کا باسی تھا اور اسرائیلی شہریوں کا وجود ختم کرنے کا پروگرام رکھنے والی تنظیم کا رکن تو تھا لیکن کسی یہودی آباد کار لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا۔ اس کے دل و دماغ میں جاری لڑائی آوارہ گرد ابھی تک بھول نہیں پایا ہے۔ بس صاحب، دشمن کے خیمے سے اٹھائی ہوئی محبوبہ پر تو گوگول بھی اپنے ناول ''تارس بلبا'' میں ناکام رہا تھا۔

آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ آنے والے وقت میں کوئی بھی اپنے پریتم سے ایسے علیحدہ نہ ہو اور نہ آنے والے وقت میں کوئی اپنے دیس سے اپنی مرضی کے خلاف نقل مکانی کرے اور نہ کوئی خانہ جنگی ایک اور بیروت پیدا کرے کیونکہ آوارہ گرد کے شہر کراچی کو بھی خوں ریزی کے باعث لوگوں نے ابھی سے بیروت کہنا شروع کر دیا ہے۔ ہاں، راتوں کو جاگنے والا اور نائٹ کلبوں، بار روموں اور ہوٹلوں کی روشنی میں آنکھیں چندھیا کر دینے والے بیروت کو کل تو کیا آوارہ گرد آج بھی قبول کرنے پر تیار ہے۔

# دہشت گردی۔ انسان کے چہرے پر لعنت

آوارہ گرد کو ایک بار پھر اپنے سب سے زیادہ پسندیدہ شہر لاہور جانے کا موقعہ ملا۔ حضوری باغ، انار کلی، لکشمی چوک، مال روڈ اور بسنت والا لاہور آوارہ گرد کو اس مرتبہ سہما ہوا لگا۔ لاہور اُس بچّے کی طرح لگ رہا تھا جس سے کوئی بڑا تھپڑ مارنے کی دھمکی دے کر اس کی جیب خرچ کے چار آنے چھین لے گیا ہو۔ چوبیس گھنٹے جشن اور میلے کی ترنگ والے لاہور میں، جہاں لوگ کھانے پینے اور تقاریب کے سوا کسی بھی دوسرے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتے، اس مرتبہ ہر ایک کے چہرے پر خوف کی پر چھائیاں تھیں۔ لاہور والوں کو اپنا شان دار شہر بھی آنے والے دنوں میں کراچی اور پشاور بنتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے لاہور میں دہشت گرد کارروائیوں نے پٹاخوں اور آتش بازی کے دلدادہ لاہوریوں کو پریشان کر دیا ہے۔

اگر چہ آوارہ گرد کے پاس لاہور کی سلامتی کے لیے نیک تمناؤں کے اظہار کے لیے یہی سبب کافی ہے کہ یہ اُس کا پسندیدہ شہر ہے اور وہاں اُس کے کئی ایک جگر دوست رہتے ہیں لیکن کراچی اور حیدر آباد میں وحشیانہ دہشت گردی کی بد روح دیکھنے والا آوارہ گرد تو اپنے ناپسندیدہ شہر اسلام آباد میں بھی دہشت گردی نہیں چاہے گا۔

دہشت گردی ہے بھی تو ایسا معاملہ جس میں کوئی انسانی زندگی صرف اس لیے موت کی حق دار بنے کہ اُس کا کسی مخصوص قوم یا علاقے، زبان، مذہب یا فرقے سے تعلق ہے، اگر ایسا نہ ہوتا

تو پھر تیس ستمبر ۱۹۸۸ء کو پکا قلعہ کے سامنے ربڑی کی دکان کے باہر کراچی سے آئی ہوئی ڈھائی تین سالہ ایک بچی کا جسم کلاشنکوف کے برسٹ کا میزبان کیوں بنتا۔

اگر چہ منظم اور سیاسی مقاصد کے لیے دہشت گردی کی عالمی لہر ۷۰ء کی دہائی میں اپنے عروج پر پہنچی، تاہم آوارہ گرد کے دیس برصغیر میں تیمور لنگ کے ہاتھوں انسانی لاشوں کے مینار بنا ہو، اورنگزیب کے ہاتھوں ہندوؤں اور شیعوں کا قتل ہو، جلیانوالہ باغ اور قصہ خوانی میں انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی نسل کشی ہو، اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء کے دوران پنجاب میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں ایک دوسرے کو مارنا ہو یا بھگت کنور رام کے سینے پر بندوق داغنے کا عمل ہو، برصغیر کی ہر گلی، ہر بستی دہشت گردی کا بھیانک چہرا نہ فقط صدیوں سے دیکھتی آئی ہے بلکہ آوارہ گرد کی رائے میں اس کا ضرورت سے زیادہ مول بھی چکا چکی ہے۔

آوارہ گرد کو یاد آ رہا ہے کہ جن دنوں سندھ بھیانک نسلی چپقلش اور قتل عام کا شکار تھا تو جامشورو ریلوے اسٹیشن (جہاں آوارہ گرد کے ایک اردو بولنے والے دوست کو، جو کراچی کے ایک رہنما کا پیغام لے کر جی ایم سیّد کے ہاں سن جا رہا تھا، کچھ سندھی طلبہ نے فقط اس لیے زدوکوب کیا تھا کہ وہ اردو بولنے والا تھا) کے قریب کراچی جانے والی ایک بس اُلٹ گئی اور عبدالستار ایدھی کے بقول اُس سندھ یونیورسٹی کے طالب علموں نے، جن کے لیے پوری دنیا کہتی ہے کہ وہ غیر سندھیوں کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے، اردو بولنے والے زخمیوں کو اپنا ''سندھی'' خون دیا۔

آوارہ گرد کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ انسان اپنے اندر عدم تشدّد کا ہی پیروکار ہے، بس کبھی کبھار کوئی ''ایڈونچر'' کر بیٹھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بندوق کی نال سے فلسطین کو آزاد کرانے کے سپنے دیکھنے والی لیلیٰ خالد لندن ایئرپورٹ سے جہاز اغوا کرنے سے قبل ایک بچّی کو بھی اُسی جہاز پر سوار ہوتا دیکھ کر اغوا کا منصوبہ ترک کرنے کا کیسے سوچتی اور جنوری ۱۹۴۷ء میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کلکتہ کے ہندو اور مسلمان ایک اکیلے گاندھی کے ''مرن بھرت'' کے ذریعے اپنی زندگی ختم کرنے کی دھمکی سے ڈر کر ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کے نعروں والے مشترکہ جلوس کس طرح نکالتے یا ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کی شاہراہیں مسلمانوں کے خون سے دھل رہی تھیں تو گاندھی کا وہی اہنسا کا ہتھیار (مرن برت) ہندو اور سکھ شرناتھیوں سے مسلمانوں کے گھر اور مساجد کیسے خالی کراتا!

لیکن آوارہ گرد کی دنیا کا المیہ یہ ہے کہ ''ایک گال پر تھپڑ مارنے والے کو اپنا دوسرا گال بھی پیش کرو'' جیسی بات کرنے والے یسوع مسیحؑ کے پیروں کار سورج کی دھرتی (جاپان) پر ایٹم بم گراتے ہیں اور ویتنام میں بچوں کو سنگینیں گھونپتے ہیں، گاندھی کے دیس باسی ''مور کی کوک پر پہاڑ کو دیپ جیسا محسوس کرنے'' والے راجستھانیوں کے دیس میں انسانوں کی تباہی کے بھیانک ہتھیار ایٹم بم کا تجربہ کرتے ہیں اور اپنی واسکٹ میں ہمیشہ گلاب کا پھول لگانے والے اور ہر جذباتی بات پر آنسو بہانے والے نہرو کی بیٹی اندرا سکھوں کے گولڈن ٹیمپل پر آپریشن کراتی ہے، پوری زندگی عدم تشدد پر کار بند گاندھی کا سینہ گولیوں سے چھلنی کیا جاتا ہے اور سکیورٹی کے بغیر گھومنے والے سوئیڈن کے وزیر اعظم اولف پالمے کو ناٹک دیکھ کر واپسی پر کسی نامعلوم قاتل کی بندوق کا لقمہ بننا پڑتا ہے۔

دہشت گردی کے خلاف اپنے ہم عصروں میں سے حسن مجتبیٰ کی نظم ''تیس ستمبر، پہلی اکتوبر، کوئی بات خوشی کی نہیں یا یہ وہ قومی ہیرو نہیں غنڈے ہیں یا انسان کے چہرے پر جیسے لعنت ہیں'' جیسی لازوال شاعری کے سوا آوارہ گرد کی نظر میں سندھ کے واحد جینئس دانش ور حشو کیول رامانی کا شیخ ایاز کو لکھا ہوا یہ جملہ بھی پڑھا ہے کہ ''اگر تم وہاں (سندھ میں) کسی مہاجر پر ہاتھ اُٹھاؤ گے تو یاد رکھنا کہ میں (حشو) بھی یہاں (بھارت میں) شرنارتھی ہوں'' تاہم دہشت گردی کے خلاف اُس نے سب سے زیادہ زوردار بات ۱۹۸۲ء میں فلسطین پناہ گزین کیمپ پر اسرائیلی جہازوں کی بم باری کے بعد ایک فلسطینی بچے کے خدا کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں کہی ہے، اُس نے لکھا تھا کہ ''او خدا! میں اور میری بہن پناہ گزین کیمپ کے ایک خیمے میں رہتے تھے، نہ جانے کہاں سے جہاز آئے اور بڑی عمر کے لوگوں کے بقول انہوں نے ہماری کیمپ پر بم پھینکے اور میری بہن مرگئی۔ میں اسپتال میں ایک ٹانگ اور ایک بازو کٹوا کر داخل ہوں۔ ہاں، کل کچھ خواتین آئی تھیں، انہوں نے مجھے مٹھائی کے ساتھ ساتھ کچھ کھلونے بھی دیے لیکن اب تم ہی بتاؤ! میں اپنی چھوٹی بہن کے بغیر اکیلے ہی ان کھلونوں سے کیسے کھیلوں!؟''

۷۰ء کی دہائی کے آخری اور اسّی کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں انقلاب کو بندوق کی نال سے آتا دیکھنے کی تمنا میں ''انقلابی'' تشدّد کو جائز سمجھنے والا آوارہ گرد اپنے دیس میں ۱۹۸۶ء سے لے کر اب تک بہنے والے انسانی خون کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انقلاب چاہے نہ آئے، چاہے دنیا کا چرخہ اسی طرح چلتا رہے لیکن تشدّد کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کیا

جاسکتا، یوں کہ بات بہ ہر صورت عدم تشدّد کے دیوتا گاندھی کی بات درست ہی ہے کہ اگر تم کسی پر ہاتھ اُٹھاؤ گے تو کوئی دوسرا تمہارے کسی پیارے پر بھی چڑھائی کرے گا اور آوارہ گرد اپنے پیاروں سے متعلق انتہائی جذباتی ہے اور وہ ان کے لیے کوئی پریشانی برداشت نہیں کرسکتا۔

☆......☆......☆

# ایدھی اور اُس کے رضا کار زندہ باد

ایدھی ٹرسٹ امریکہ کے چیئر مین عبدالستار اوزا نیویارک میں انتقال کر گئے۔ چالیس سال سے عبدالستار ایدھی کے رضا کار اوز ان سے آوارہ گرد کو دو مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ تیس سال امریکہ میں رہنے کے باوجود وہاں کی ہوا اُن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی تھی۔ وہ نیویارک میں پچیس سال وکالت کرنے کے باوجود میٹھا در یا کھارادر کے میمن ہی تھے۔ ذیابیطس کے آخری درجے کے مریض ہونے کے باوجود وہ میٹھی چیزیں کھا کر خود کو انسولین کے انجکشن لگا کر زندگی گزارتے تھے۔ وہ نیویارک سے شایع ہونے والے ایدھی ویلفیئر جرنل کے مدیر بھی تھے اور دیگر امریکی صحافیوں کی طرح ان کے پاس بھی نیویارک پولیس کا جاری کردہ ایک کارڈ تھا۔ ایک دن وہ آوارہ گرد کے ساتھ کراچی میں واقع بھارتی قونصل خانے گئے تو اپنے امریکی پاسپورٹ کی وجہ سے سیدھے قونصل خانے کے اندر چلے گئے۔ واپسی پر جب کچھ انٹیلی جنس والوں نے انہیں روک کر تفتیش شروع کی تو اوزا صاحب کو میٹھا در اور امریکہ کی مشترکہ گرمی چڑھ گئی اور وہ سرکاری اہلکاروں پر آستین چڑھا بیٹھے۔ کافی دیر کے بحث مباحثے کے بعد نہ جانے کس ترنگ میں عبدالستار اوزا نے انہیں نیویارک پولیس کا جاری کردہ کارڈ دکھایا۔ اب صاحب! آوارہ گرد کے دیس کے بچارے ان پڑھ یا نیم پڑھے لکھے جاسوس سپاہی، انہیں امریکی پولیس کا کوئی اہلکار سمجھ کر ایڑیاں بجا کر سلوٹ کرنے لگے۔

آوارہ گرد نے عبدالستار اوزا کے ساتھ کوئی طویل سفر تو نہیں کیا تاہم جو دوست اُن کے ساتھ سفر پر گئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ سفر کے دوران اُن پر میٹھادر اور امریکہ کے مشترکہ باسی کی کیفیتیں چھائی رہتی ہیں۔

آوارہ گرد نے ایک مرتبہ عبدالستار ایدھی کے ساتھ کراچی سے ٹھٹھہ کا سفر کرنے کے بعد اپنے دوستوں کو بتایا تھا کہ اُسے اس سفر میں ایدھی ایسا بچہ لگا جو پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلا ہو۔ وہ پورا راستہ ہر آنے جانے والی گاڑی اور شخص کو ہاتھ ہلا کر سلام کر رہے تھے۔ یہ بات جب آوارہ گرد نے ایدھی ٹرسٹ کے ہی کسی کام سے کراچی سے جیکب آباد جاتے ہوئے اپنے ساتھی رحیم بخش آزاد کو بتائی تو وہ بھی راستے سے گزرنے والی ہر گاڑی اور شخص کو سلام کرنے لگے اور جواباً لوگ بھی انہیں سلام کرنے لگے، تاہم آوارہ گرد کی رائے میں یہ سلام وہ آزاد کے بجائے ایدھی کی گاڑی کو کر رہے تھے۔

آوارہ گرد ۱۹۸۶ء میں قربانی کی کھالیں جمع کرنے سے لے کر ۱۹۹۶ء میں ایدھی کی سوانح عمری سندھی میں ترجمہ کرنے پر رضا مندی ظاہر کرنے تک ایدھی ٹرسٹ کی کچھ سرگرمیوں میں شریک رہا ہے۔ اگر چہ ایدھی ٹرسٹ کی عمومی سرگرمیوں میں زخمیوں، بیماروں کو ایمبولنس کے ذریعے اسپتال پہنچانا، لاوارثوں کی تدفین، ذہنی طور پر اپاہج یا بے گھروں کو سائبان فراہم کرنا شامل ہیں تاہم ایدھی ٹرسٹ سے اپنی وابستگی کے دوران آوارہ گرد نے ہر روز ایک نیا کام اور نئی سرگرمی دیکھی ہے۔

آوارہ گرد کو اپنے کچھ جاننے والوں کے اس ''اعتراض'' سے کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ایدھی کے معاملے میں جذباتی ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جذباتی ہونے کا تعلق ہے تو کسی بھی وابستگی پر جذباتی ہونا فطری امر ہے اور آوارہ گردی کی رائے میں یہ کسی کے زندہ ہونے کا ثبوت بھی ہے۔ آوارہ گرد کا ایک دوست ایک مرتبہ اپنے پسندیدہ شاعر پر کوئی منفی تبصرہ ہونے پر نہ صرف جھگڑنے لگا تھا بلکہ کافی عرصہ ناراض بھی رہا، اب اگر ڈھائی تین سو سال پہلے کے کسی شاعر پر جذباتی ہونا ممکن ہے تو ایدھی کی خدمات اور سرگرمیوں کے چشم دید گواہ ہونے کے بعد اگر آوارہ گرد جذباتی نہ ہو تو وہ کوئی اور تو ہو سکتا ہے، آوارہ گرد نہیں رہ سکتا!

آوارہ گرد سوانح عمریاں انتہائی دلچسپی سے پڑھتا ہے اور اب تک پڑھی ہوئی سوانح عمریوں سے اُس نے یہی کچھ حاصل کیا ہے کہ پیغمبروں سے لے کر ہالی وڈ کے فلمی اداکاروں

تک، سماجی کارکنوں سے لے کر سیاسی رہنماؤں تک ہر ایک لوگوں بالخصوص ''قلم قصائی'' کی تنقید کا نشانہ بنا ہے۔

لیکن آوارہ گرد کی رائے میں چوں کہ اُس کے دیس میں مسکین جھان خان کھوسو جیسی محدود خدمات والے سماجی کارکن کے سوا اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوا ہے اس لیے وہ ایدھی پر ایسے الزامات عائد کرتے ہیں جن پر دومنٹ تک سوچنا آوارہ گرد جیسے فارغ شخص کو بھی وقت کا زیاں لگتا ہے۔

آوارہ گرد کو شیخ عبدالمجید سندھی کے پوتے کامران شیخ نے بتایا تھا کہ آخری ایام میں شیخ صاحب کی یادداشت متاثر ہونے لگی تھی اور ایک دن وہ گھر سے نکلے تو پلٹ کر نہیں آئے۔ ان کے گھر والوں نے پولیس کو اطلاع دی تو پولس نے حسب معمول ٹال مٹول کی۔ جب سندھی قوم پرست تحریک کے ایک بزرگ شیخ عبدالمجید سندھی کے خاندان نے ایدھی ٹرسٹ کو اس گمشدگی کی اطلاع دی تو انہوں نے بمبئ سے سندھ کی آزادی کے رہنما شیخ صاحب کو تلاش کر کے ورثا کے حوالے کیا۔ جن دنوں ایدھی پر یہ الزام عائد کیا جارہا تھا کہ ان کی ایمبولنس سروس حیدر آباد اور کراچی میں سندھیوں کے قتل عام کے لیے اسلحہ کی ترسیل میں مصروف ہیں تو انہی دنوں میں ایدھی ایئر ایمبولنس کے جہاز میں جئے سندھ محاذ کے سکھر جیل میں مقیّد ایک رہنما کو جناح اسپتال کراچی منتقل کیا جارہا تھا۔ جب ''سندھ قوم کے سورما'' حیدر آباد کی سڑکوں پر نصف گھنٹے میں دو ڈھائی سو افراد کو ہلاک کر کے ایڑیوں پر زور دے رہے تھے تو کراچی میں کئی سندھیوں کو بچانے کے لیے فقط ایدھی ٹرسٹ کی گاڑیاں اور اس کے رضا کار تھے ورنہ سندھیوں کے دفاع یا نجات کے لیے لہو بہانے کے دعوے دار تو اپنا پسینہ خشک کر رہے تھے۔

آوارہ گرد کو یاد آرہا ہے کہ سندھ میں فوجی آپریشن شروع ہونے کے بعد عبدالواحد آریسر کو بھی گرفتار کیا گیا اور آزاد ہونے کے بعد وہ جب پہلی مرتبہ اُن سے خالق جونیجو کے گھر پر ملا، تو انہوں نے دو باتوں کی وجہ سے آوارہ گرد کو حیران و پریشان کر دیا تھا۔ آوارہ گرد آریسر کے سیاسی نقطۂ نظر کا مخالف ہونے کے باوجود بھی اُن کی بردباری، سنجیدگی اور ثابت قدمی سے انکار نہیں کرتا تاہم اُس رات وہ کچھ ٹوٹا پھوٹا لگا تھا۔ آریسر کے بقول جب فوجی اہلکاروں نے انہیں بتایا کہ انہیں رہا کیا جارہا ہے تو انہوں نے فوجیوں سے کہا کہ اُسے کسی بھی ایدھی سینٹر پر چھوڑا جائے۔ آوارہ گرد کو اتنا یقین ہے کہ آریسر اُس وقت جھوٹ نہیں بول رہے تھے کیوں کہ

وہ جس حالت میں تھے اُس میں سچ کے سوا کچھ نہیں بولا جاتا۔

اور آج جب یہ الزام عائد کیے جا رہے ہیں کہ وہ تمام تر دولت سمیٹ کر ملک سے فرار ہونا چاہتے ہیں تو ایدھی اس تگ ودو میں ہے کہ کسی طرح ایدھی ٹرسٹ کا کام مناسب لوگوں کے سپرد کر کے اپنی بیوی بلقیس ایدھی کے ساتھ جونا مارکیٹ میں دو کمروں کے اپنی ماں کے گھر میں زندگی کے باقی ایام گزارے۔

بلقیس کے ذکر پر آوارہ گرد کو ونی منڈیلا کا وہ انٹرویو یاد آ رہا ہے جس میں اُس نے انکشاف کیا تھا کہ اُس کی اور نیلسن منڈیلا کی شادی کو پچیس سال ہو چکے ہیں لیکن ایک جوان بیٹی کے باوجود وہ (ونی) خود کو نئی نویلی دلہن ہی سمجھتی ہیں کیوں کہ میاں بیوی کو ایک ساتھ وقت گزارنے کا موقع ہی کم ملا ہے۔ بلقیس اور عبدالستار ایدھی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ شادی کے دن ایک زخمی کو اسپتال لے جانے والے شوہر کا وہ آج بھی اُسی طرح انتظار کرتی رہتی ہیں۔

ایدھی ٹرسٹ کے ذکر پر یاد آیا کہ جب امریکہ نے اقوام متحدہ کے بجٹ میں اپنا مکمل حصہ دینے سے بھاگنے کی کوشش کی تو امریکہ کے کئی ایک شہریوں نے نہ صرف اس رقم کے فی کس حصے کے طور پر اپنے حصّے کی رقم اقوام متحدہ کو روانہ کی بلکہ اپنی حکومت کے اس انسان دشمن رویے پر معذرت بھی کی۔ آوارہ گرد کے بھی ایک دوست نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ جب ایدھی اسلام آباد کی طرح کراچی میں بھی اپنی کتاب فروخت کرنے کے لیے اسٹال لگائیں گے تو وہ ایک کتاب ضرور خرید کرے گا کیوں کہ وہ خود کو ایدھی کا مقروض سمجھتا ہے۔

آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ اس کے تمام دیس باسی مل کر ایدھی کی منّت کریں کہ وہ کبھی بھی انہیں چھوڑ کر نہ جائیں کیوں کہ ایدھی کی ضرورت فقط لاشوں کو نہیں بلکہ ہم زندہ بچ جانے والوں کو بھی ہے۔

☆......☆......☆

# ارونا کی اروما

برصغیر میں آزادی کی جدو جہد کی سورما ارونا آصف علی کا انتقال ہوگیا۔ آج کے برصغیر میں جہاں نو آبادیاتی راج کے مضبوط اور طاقت ور بازو بننے والے ہی لوگوں کی قسمت کے مالک بنے بیٹھے ہیں، ارونا سچ مچ کی باغی کا کردار اکیلے طور پر نبھاتی رہیں۔ انگریزوں کے خلاف بموں اور گولیوں سے لڑنے والی ارونا سماج کے ردعمل کے بجائے اپنے ہر قدم اور عمل میں باغی تھیں۔ وہ پہلی برہمن خاتون تھیں جس نے عاشقانہ اور عقلی فیصلے کے ساتھ ایک مسلمان سے شادی کی۔ آج کے بھارت میں تو سماجی و تاریخی ماہر عائشہ کی رام سے شادی مشہور ہے لیکن ستر پچھتر سال قبل جب پانی بھی ہندو اور مسلمان ہوتا تھا، یہ بغاوت کا بیباک اور اچھوتا اظہار تھا۔ لیکن آوارہ گرد سوچتا ہے کہ کیا ارونا کی شناخت فقط یہی تھی کہ اُس نے باغی من کے ساتھ ایک سوشلسٹ مسلمان سے بیاہ کیا تھا؟ وہ تو برصغیر کے واحد "دہشت گرد" کارکن تھی جس کے لیے اہنسا کے پیغمبر گاندھی نے دو مرتبہ انگریز وائسرائے سے اپنے مذاکرات ملتوی کر دیے تھے۔

اگرچہ آوارہ گرد کے برصغیر میں آزادی کے بعد والے ایام "چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا" ثابت ہوئے ہیں لیکن نئی دہلی کی پہلی میئر منتخب ہونے کے بعد ارونا آصف علی نے جو کام کرائے وہ آوارہ گرد کی رائے میں منزل کے پہلے پڑاؤ تک پہنچنے والوں کو ہی بھاتے ہیں۔ آوارہ گرد کے خیال میں اپنی نگرانی میں بنوائی جانے والی سرکاری اسپتال میں زندگی کے آخری

ایّام گزارتے ہوئے ارونا کی آتما کم از کم اس بات پر ضرور مطمئن ہوگی کہ سرمد کی قتل گاہ اور ایل کے ایڈوانی کی پناہ گاہ نئی دہلی میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں انسانوں کی زندگی کے لیے تگ ودو کی جاتی ہے۔ آوارہ گرد کو یاد آ رہا ہے کہ بابری مسجد کی تکرار کے دنوں میں جب بھارت میں شیو سینا اور بجرنگ بلی کے کارکنوں نے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا یا مارنا شروع کیا تو ارونا آصف علی نے ۸۲ سالہ عمر میں بھی اس کے خلاف احتجاجی جلوس کی قیادت کی تھی اور ایک بھارتی صحافی کے مطابق شر پسندوں کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ارونا کے سامنے آئیں۔ آوارہ گرد کی رائے میں اس سے زیادہ پذیرائی شاید ہی آزادی کے کسی جیالے کے حصّے میں آئی ہو۔

برصغیر میں آزادی کی جدو جہد کے رنگ ہی نرالے تھے۔ ایک طرف انگریزوں کی خوشامد کرنے اور ان کی بگھی کو گھوڑوں کی جگہ کھینچ کر سر یا خان بہادر اور دیگر القاب پانے والے تھے تو دوسری جانب کلپنادت، ارونا آصف علی اور سکھ دیو جیسے جی دار تھے جو بموں اور گولیوں سے ایسے کھیلتے تھے جیسے بسنت رت میں چنچل جوانیاں جھولوں پر جھولتی ہیں۔

آوارہ گرد کو یاد آیا کہ برصغیر کے دانش ور سیاستدان جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں کہیں لکھا ہے کہ اُن کی اھنسا والی سیاست کی مخالفت کرتے ہوئے کسی ''بم پارٹی'' کے دو کم زور سے نوجوان ان سے ملنے یا لڑنے آئے، نہرو کے بقول کم زور جسم اور جوتی بھرے نینوں والے یہ نوجوان دو گھنٹے تک اپنے موقف پر بات چیت کرتے رہے۔ نہرو اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ آج جب برصغیر آزاد ہو چکا ہے تو گاندھی کے عدم تشدّد کے فلسفے کو اپنی ریت سمجھنے والے بھارت کو ان کم زور نوجوانوں کو نہیں بھولنا چاہیے جو نہ جانے کس محاذ پر بم یا گولی کا لقمہ بن چکے ہوں گے!

آوارہ گرد بھگت سنگھ پر بننے والی فلم کا وہ سین کبھی بھی نہیں بھول سکتا جس میں بھگت سنگھ پھانسی سے قبل آخری ملاقات پر اپنی ماں کو بسنتی رنگ کا کُرتا لانے کو کہتا ہے کیوں کہ اُس کے بقول سولی پر جھولنے کا پل اس کے اور اس کی پریتما ''آزادی'' کے ملاپ کی گھڑی ہوگی۔ اور ہاں بھگت سنگھ کا ساتھی اجے کمار گھوش جب پولس سے مقابلہ کرتے ہوئے جان کی بازی ہار چکے تو بھی پولیس ڈیڑھ گھنٹے تک اُس درخت کے قریب نہیں گئی تھی جس کے پیچھے سے انہوں نے پولس پر فائرنگ کی تھی اور ان کے مرنے کے بعد جب وہ درخت ہندوستانیوں کے لیے کسی متھرا، کاشی، ملتان جیسا مقدس بن گیا تو انگریزوں نے وہ درخت ہی کٹوا دیا لیکن وہ اجے کمار

گھوش جیسے انیک سورماؤں کی یاد بقول ابراہیم جلیس کے چالیس کروڑ بھکاریوں کے من سے نکال نہیں سکے۔

آوارہ گرد کے سیاسی کارکن ہونے والے دنوں میں اُسے کسی بوڑھی رشتہ دار خاتون نے بتایا تھا کہ اُس کا بھائی کانگریسی تھا اور جب چرخہ کاتتے ہوئے جیل گیا تھا تو انہوں نے اپنے بھائی کے چہرے پر اپنی شادی کے دن سے بھی زیادہ خوشی دیکھی تھی۔ آوارہ گرد کی رائے میں اپنے من میں کیے ہوئے فیصلے کی یہ شانتی ہی ہے جس نے یشپال کے ناول ''ساتھی'' کے مرکزی کردار سے اپنے چہرے پر خود تیزاب انڈیل کر سیاسی کام کرایا۔ خوش حال بنئے سیٹھ کے بیٹے ہیموں کالانی سے ریل کی پٹڑیاں اُکھیڑوائیں اور کلپنادت سے انگریز وائسرائے پر بم پھنکوایا اور اُس سے معافی مانگنے کے طلب گار انگریز مجسٹریٹ کو آزاد ہونے کی صورت میں دوبارہ حملہ کرنے کی دھمکی دلواتا ہے۔

بس آوارہ گرد اس کے سوا دوسری کیا خواہش کر سکتا ہے کہ اپنی جانیں یا جوانیاں اور پیارے کسی مقصد کو ارپن کرنے والوں کو بھولنا نہیں چاہیے تاکہ کوئی بھی یہ نہ کہہ پائے کہ ''چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا!''

☆......☆......☆

# دیس چھوڑ کر پردیس بھٹکنے والوں کا نوحہ

ترقی پسند دانش ور اور سماجی علوم کے ماہر ڈاکٹر فیروز احمد کا پچھلے دنوں واشنگٹن میں انتقال ہوگیا۔ ۷۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں ملک پر مسلّط مارشل لا کے مخالف پڑھے لکھے کارکنوں کے لیے ڈاکٹر فیروز کا اردو جریدہ ''پاکستان فورم'' جدو جہد کی مشعل راہ رہا ہے۔ کراچی کے کچھی بولنے والے آغا خانی خاندان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر فیروز جذباتی انداز میں سندھ کی سیاست سے وابستہ ہوئے اور بعد ازاں یہاں کی جماعتوں اور رہنماؤں سے مایوس ہو کر ۱۹۸۰ءمیں امریکہ جا بسے۔ ستّر کی دہائی کے ابتدائی برسوں مین کینیڈا سے انگریزی جریدہ ''پاکستان فورم'' جاری کرنے والے ڈاکٹر فیروز کی تیسری دنیا میں سامراجی اثرات اور انگولا اور افغانستان کے انقلابات سے متعلق کتابوں کو خاص پذیرائی ملی۔ انگولا کے کمیونسٹ صدر اگست نیو نیتو اور افغانستان کے صدر حفیظ اللہ امین کے ذاتی دوست ڈاکٹر فیروز کو سندھ کے ''منی ماؤ زے تنگ'' نے برداشت نہیں کیا اور اُن دنوں سندھ کی قومی اور طبقاتی جدوجہد کی علم برداری کی دعویٰ کرنے والی جماعت کے سربراہ انہیں سندھ کے معروضی حالات سے بے خبر اور علمی جدو جہد کے بجائے کتابی باتیں کرنے والا ظاہر کر کے ہر مرحلے پر پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر فیروز کے جریدے پاکستان فورم کے ذکر پر آوارہ گرد کو یاد آیا کہ اُس کا ان دنوں ایک ساتھی گل محمد خشک یہ جریدہ کراچی سے ٹھٹھہ جانے والی بسوں میں بھی فروخت کرتا تھا، اس

سے اُس کو دو فائدے ہوتے تھے ایک تو رسالے کی پچھ کاپیاں فروخت ہوجاتی تھیں دوسرا کنڈیکٹر کرایہ بھی نہیں لیتے تھے۔

سو ڈاکٹر فیروز یہاں کی جماعتوں اور رہنماؤں کے رویوں سے مایوس ہوکر خاصی حد تک انقلاب سے ہی دست بردار ہوکر امریکہ چلے گئے، جہاں وہ سماجی اور لسانی علوم بالخصوص سندھ اور برصغیر کی سیاہ فام آبادی پر اتھارٹی سمجھے جانے لگے۔ سندھ میں رہنے والے سیاہ فام شہریوں کا بین الاقوامی سطح پر ذکر بھی شاید فیروز جتنا کسی نے نہیں کیا ہوگا۔

اپنا پس ماندہ دیس چھوڑ کر پردیس اور بالخصوص مغرب جاکر بسنے والوں میں ڈاکٹر فیروز کوئی تنہا نہیں۔ جدید دنیا میں ترقی کی غیر برابری کی وجہ سے آوارہ گرد کے دیس جیسے پس ماندہ ممالک کے لوگوں بالخصوص پیشہ ور علوم اور مہارت رکھنے والے مغرب کی جانب اس طرح دوڑتے ہیں جیسے کراچی اور حیدرآباد میں نہاری کے ہوٹلوں پر ہیروئن کے موالی، لیکن المیہ تو یہ ہے کہ ان پڑھے لکھے اور عام طور پر عمومی سماج سے دو قدم آگے بڑھے ہوئے ان افراد کو وہاں مفت تو چھوڑیں عمومی محنت کے نتیجے میں بھی بنیادی سہولیات برابری کی بنیاد پر نہیں مل پاتی ہیں۔

آوارہ گرد ایک ایسے شخص کو بھی جانتا ہے جو پاکستان کے ایک مالیاتی ادارے میں بہت بڑا افسر تھا لیکن اب وہ امریکہ میں ایک پیٹرول پمپ پر پیٹرول بھرتا ہے، لیکن یہ امر المیہ تو اُس وقت بنتا ہے جب یہ پڑھے لکھے لوگ جو سماجی طور پر باشعور ہونے کی نہ صرف بات کرتے ہیں بلکہ کسی حد تک اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں، حالات سے تھک کر دیس کو ڈوبتے جہاز سے بھاگتے چوہوں کی طرح چھوڑ کر پردیس جاکر بسیرا کرتے ہیں۔

اب انہیں کون بتائے کہ حالات سے تنگ آکر یا اپنے ذاتی بہتر مستقبل کے لیے ملک چھوڑ جانے والوں کو ان کے ہی ہم دیس بھی اپنا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ آوارہ گرد کو کسی نے بتایا تھا کہ سری لنکا کے کسی دور دراز علاقے میں ایک قبیلہ دنیا جہان سے کٹ کر رہتا ہے۔ اس قبیلے کا خیال ہے کہ بیرونی دنیا سے ان کا تعلق ان کے لیے مناسب نہیں تاہم اس کے باوجود اگر قبیلے کا کوئی فرد قبیلہ چھوڑ جاتا ہے اور پھر وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ بن جائے لیکن قبیلے والے اُسے Disown کرتے ہوئے ''شنگورا'' کہتے ہیں۔

آوارہ گرد کے دیس نے جہاں ۶۰ء کی دہائی کی ترقی پسند طلبہ تحریک کے ایک بین الاقوامی رہنما اور دانش ور طارق علی، ڈاکٹر رحمان اور کچھ سال قبل امریکہ میں انتقال کرنے

والے صحافی الطاف صدیقی کو ہمیشہ کے لیے پردیس جاتے دیکھا ہے وہاں اُس نے عبدالستار ایدھی، اختر حمید خان، اسماجہانگیر، دراب پٹیل، ڈاکٹر صالح میمن اور ادیب رضوی جیسے آدرشی انسانوں کو منفی قوتوں کے آگے جھک کر دیس چھوڑ کر پردیس بھٹکنے سے اونچی گردن کے ساتھ انکار کرتے بھی دیکھا ہے۔

آوارہ گرد کو ذوالفقار علی بھٹو، جی ایم سید اور ستر کی دہائی میں بلوچستان میں ترقیاتی کاموں میں مصروف نوجوان انجینئر ناصر حسن کی موت پر افسوس کے ساتھ اس لیے بھی فخر ہوتا ہے کہ اُن کے زندگی کے عیوض دیس چھوڑنے سے انکار نے آوارہ گرد جیسے کئی بے یارو مددگار لوگوں کو بھاگنے سے روکا ہے۔

آوارہ گرد کو اپنے دوست ڈاکٹر شیر شاہ کی اس بات سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرسکتا کہ ہمارے ملک کا نظام کرپٹ ہوچکا ہے اور اس میں بہتری کے امکان بالکل نہیں رہے اور یہ دیمک زدہ سماج تمام باصلاحیت افراد کو اپنا حصہ بناتا ہے یا انہیں جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن آوارہ گرد کی رائے میں بات بھٹائی کی بھی درست ہے کہ ''بھاگے ہوئے سے میرا کیا سمبندھ، جو میدان میں مارا گیا سو میرا۔''

آوارہ گرد کو یاد آیا کہ اُس کے کچھ کمیونسٹ دوست ۱۹۹۲ء میں بارسلونا اولمپکس کے دنوں میں اسپین میں منعقدہ کسی کمیونسٹ اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے، واپسی پر پتہ یہ لگا کہ وہاں گئے ہوئے کچھ لوگ ''کھسک'' گئے۔ واپس لوٹ آنے والوں میں سے ایک نے آوارہ گرد کو بتایا کہ وہاں شراب بھی بہت ہے اور لڑکیوں سے دوستی کے امکان بھی زیادہ ہیں، وہاں تھوڑا بہت کمایا بھی جاسکتا ہے لیکن یار اپنے ملک کو خراب حالات میں چھوڑ کر جانا بہادری تو نہیں۔ آوارہ گرد ایک ایسے نوجوان ڈاکٹر کو جانتا ہے جس نے اپنے انگریز باس کو کہا تھا کہ وہ کسی فرسٹ کلاس ملک کے تھرڈ کلاس شہری کے طور سے رہنے پر کسی تھرڈ کلاس ملک کے فرسٹ کلاس شہری بن کر رہنے کو ترجیح دے گا، اگرچہ یہ جملہ کسی فلمی ڈائیلاگ جیسا لگتا ہے لیکن آوارہ گرد نے اس کے کئی ایک عملی مظاہرے دیکھے اور سُنے بھی ہیں۔ برطانیہ اور پاکستان کے درمیان کرکٹ سیریز کے موقعہ پر دی نیوز اخبار میں شایع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق ان میچوں کے دوران فقط پاکستان سے نقل مکانی کرنے والے بڑی عمر کے لوگ بلکہ وہاں، پیدا ہونے والے ان کے بچّے اور بھارتی نژاد شہری بھی پاکستانی ٹیم کی حمایت کررہے تھے، اس کا سبب پاکستانیت

یا ایشیا پرستی نہیں بلکہ سفید چمڑی والے مقامی انگریزوں کا ان بھوری چمڑی والوں کے ساتھ نسلی امتیاز تھا۔

آوارہ گرد کی بس اتنی خواہش ہے کہ آنے والے دنوں میں اس کے دیس کا کوئی باصلاحیت سید ودل شاہ یا ڈاکٹر فیروز احمد پردیس میں جا کر نہ مرے، یہاں ہی دکھ سکھ کی گھڑیاں مل کر گزارے۔ آوارہ گرد پردیس جانے والے اپنے تمام دیس باسیوں سے بس اتنی فرمائش کرتا ہے کہ وہ بھارتی فلم ''نام'' کا دیش پریمی گیت ایک مرتبہ ضرور سنیں اور پھر اگر دیس کی یاد ان کی آنکھوں میں موتیوں جیسے آنسو لائے تو لوٹ آئیں انہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔

☆......☆......☆

# موت......؟

آوارہ گرد اکثر ایک معاملے پر سنجیدگی سے سوچتے ہوئے پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ معاملہ ہے موت کا۔ موت کیا ہے، اس سے کیسے مدّمقابل ہوا جائے، موت کی مزاحمت کی جائے یا خیر مقدم۔ موت میں جیتے جاگتے انسان کو کیا، کیوں، کیسے Act کرنا چاہیے اور سب سے زیادہ جس بات نے آوارہ گرد کو پریشان کیا ہے وہ یہ کہ کیا آوارہ گرد جیسے لوگوں کو جنھوں نے زندگی میں کسی بھی مذہب کے ساتھ تعلق نہیں رکھا، مرنے کے بعد کسی ایک مذہب کی رسومات کے مطابق ہی کسی منزل کو پہنچایا جائے!

آوارہ گرد بچپن سے ہی دوسروں سے سنتا آرہا ہے کہ موت برحق ہے، موت ناگزیر ہے، زندگی ایک بسیرا ہے، زندگی کے سرخ رخسار پر موت سیاہ تل ہے، لیکن اُسے زندگی میں کوئی ایسا شخص مشکل سے ہی ملا ہے جس نے مسکراتے ہوئے موت کو قبول کیا ہو۔

ہے تو حساس مذہبی معاملہ لیکن آوارہ گرد کئی ایک علما سے پوچھتا رہا ہے کہ کیا جنّت یا دوزخ کسی دوسری دنیا میں ہیں اور کیا زندگی کا خاتمہ ممکن ہے۔ آوارہ گرد کے ایک واقف مذہبی عالم کا تو یہ کہنا ہے کہ زندگی کا خاتمہ یا قیامت دراصل علامتی بات ہے، اگر انسان خلق خدا کے لیے تکالیف پیدا کرتا ہے تو یہ عمل اس کی روح کی موت ہے اور روح کی موت ہی قیامت (فنا) ہے۔

اب آوارہ گرد جیسے Confused لوگوں کے سامنے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا انسان واقعی خدا کا مظہر ہے، جیسا کہ صوفی کہتے ہیں یا جیسے منصور حلاّج انا الحق کہتا ہے یا سرمد تو ''اگر کوئی خدا ہے تو پھر وہ ابھے چند ہے اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' تک کہتا ہے۔

آوارہ گرد کو اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کہ'' جانکاری سب سے بڑا عذاب ہے۔'' لیکن جو جان گئے اور جنہیں خود خدا نے کہا، ''اقرأ'' (پڑھ) وہ کیا کریں!

آوارہ گرد نے کہیں پڑھا تھا کہ اندرا گاندھی اپنے قتل سے کچھ عرصہ قبل اس جگہ زیادہ جانے لگی تھیں جہاں انہیں قتل کیا گیا...... کیا کچھ لوگوں کی طرح انہیں بھی اپنی موت کے شگون ملے تھے۔ آوارہ گرد یہ بھی سوچتا ہے کہ کیا اُسے بھی اپنی موت کی پیشگی اطلاع ملے گی، اگر ایسا ہوا تو پھر آوارہ گرد اپنے باقی بچے کام مکمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ وہ اپنی خواہش کے مطابق ایک زور دار ناول لکھنا چاہے گا اور اپنے ایک دوست کی فرمائش پر اپنی متنازعہ یادداشتوں پر مبنی ''سوانح عمری'' بھی لکھنا چاہے گا۔

کچھ عرصہ ہوا آوارہ گرد اپنے ایک شاعر دوست سے گپ شپ کر رہا تھا کہ اُس نے کہا تم جو کسی مذہب کو نہیں مانتے اور جس کی تمام مذاہب کے ماننے والوں سے دوستی ہے، مرنے کے بعد اپنی رسومات، کریہ کرم، کفن دفن یا Service کس طرح کرنے کی خواہش یا وصیت کرو گے؟ آوارہ گرد کی رائے میں جس طرح شیر خوار بچّہ اور بے بس بوڑھا کسی اور کے بس میں ہوتے ہیں اس طرح مرنے والا بھی دوسروں کے ہی بس میں ہوتا ہے۔ شیخ ایاز نے تو سبطِ حسن کی موت پر اپنی نظم میں کہا تھا کہ سبطِ حسن دہلی میں مر گیا اور کسی نے بھی اُس سے نہیں پوچھا کہ وہ کہاں دفن ہونا چاہے گا۔ لیکن آوارہ گرد تو یہاں تک کہے گا کہ کسی نے اُس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ پوری زندگی کمیونسٹ رہنے والا سبطِ حسن مرنے کے بعد اپنی رسومات کس طرح چاہے گا۔ کیا ہر ایک کو یقین ہے کہ وہ ن م راشد کی طرح اگنی سنسکار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ کیا اُن کے من میں بھی نہرو کی طرح اپنی راکھ ہمالیہ سے اڑانے کی خواہش نہیں ہوگی۔

شیخ ایاز کی نظم ''جفاکش کے لیے دیس بھی ویسا تو پردیس بھی ویسا'' جیسی سوچ رکھنے والے آوارہ گرد نے کئی لوگوں کو اپنے پیاروں کی لاشیں اپنے آبائی دیس لے جانے یا سرحدوں کی دوسری جانب رہنے والے کئی ہندوؤں کو یہ خواہش کرتے ہوئے دیکھا، سنا یا پڑھا ہے کہ مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں گنگا کے بجائے سندھو کے حوالے کی جائیں۔ کیا اپنی دھرتی پر یا

اپنے لوگوں میں دم دینے یا دفن ہونا صرف پردیس میں رہ کر دیس میں چاند اُبھرتے پل اور دیس کے ساون کو یاد کرکے رونے والے آوارہ گرد کے ہم دیسی برصغیر والوں کا ہی مسئلہ ہے یا یہ ہر ایک کی واردات ہے!

آوارہ گرد کو یاد پڑتا ہے کہ عبدالواحد آریسر نے ایک مجلس میں ایک ایسی کتاب کا ذکر کیا تھا جو موت کو چھو کر آنے والے لوگوں کے تجربات پر مشتمل تھی۔ شاید یہ کتاب آوارہ گرد کو اپنی ذہنی خلفشار سے نکالنے میں مددگار ہو۔

باقی صاحب، موت کے رنگ ہی اپنے ہیں۔ کچھ موت کو نفس کے شکار جسم سے نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو کچھ دوبارہ لوٹ آنے کے لیے دم لینا سمجھتے ہیں، کچھ مرنے کے بعد دفن ہوکر بڑے بڑے مقابر بنواتے ہیں تو کچھ مرنے کے بعد اپنے پیاروں کو چیلوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

بہ ہر حال ایک بات تو آوارہ گرد کے پاس طے شدہ ہے کہ انسان کا نام ونشان اس کی زندگی میں کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے باقی رہتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر شاعرہ قرۃ العین طاہرہ ایک بے نام کنویں میں پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دفن ہونے کے بعد بھی بہتر مستقبل کی تمنا کرنے والوں کے پاس زندہ نہ ہوتی اور پھر بلھے شاہ نے کچھ غلط نہیں کہا کہ:

''وے بھلیا اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور وے۔''

بس کوئی سچ پوچھے تو آوارہ گرد کی اتنی سی خواہش ہے کہ اس کے مرنے کے بعد تمام مذہبی یا لامذہب لوگ اپنے اپنے طریقے کے مطابق اُسے رخصت کریں اور بعد میں اس کی ہڈیوں کا پنجر کسی اسپتال کے حوالے کردیا جائے۔ شاید یہ خواہش آوارہ گرد کی دنیا میں طلب کا اظہار ہے اور وہ اپنے اس جنم کے بعد بھی کسی نہ کسی بہانے دنیا میں رہنا چاہتا ہو کیوں کہ دوسرا جنم نہ جانے اُس کے نصیب میں ہے کہ نہیں۔

☆......☆......☆

| | | |
|---|---|---|
| زمین کا نوحہ | جوہری تباہ کاری کے خلاف ادب | مرتبہ: ضمیر نیازی |
| کتاب عشق | تصوف | ترجمہ: پروفیسر لطیف اللہ |
| آنگن میں ستارے | شخصی خاکے | ڈاکٹر اسلم فرخی |
| تنقید و تحقیق | تنقیدی مضامین | ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان |
| کہانیاں گم ہوجاتی ہیں | افسانے | فاطمہ حسن |
| چیخ | ناول | انورسن رائے |
| راستے مجھے بلاتے ہیں | افسانے | عذرا عباس |
| زندگی سے کٹا ہوا ٹکڑا | افسانے/نظمیں | ولی رام ولبھ |
| دیا اور دریا | ناول | افضل احسن رندھاوا |
| ہالہ | ناول | کارلوس فیونتیس |
| دل کی تنہائی | افسانے | شیر شاہ سید |
| جس کو دل کہتے تھے | افسانے | شیر شاہ سید |
| دل کی بساط | افسانے | شیر شاہ سید |
| دوسروں کی شاعری | عالمی شاعری کا انتخاب | ترجمہ: ضمیر احمد |
| دیدۂ بینا | خاکے | نذر الحسن صدیقی |
| پرانی نمائش | شاعری | حارث خلیق |
| نقش فریادی اور حسن | تنقیدی مضامین | مصطفیٰ کریم |
| باقیات بیدی | منتشر تحریریں | راجندر سنگھ بیدی |
| اور کہاں تک جانا ہے | شاعری | اکبر معصوم |

SCHEHERZADE

| | | |
|---|---|---|
| پیلی چھتری والی لڑکی | ناول | اُدے پرکاش |
| سترہ کہانیاں | افسانے | امرتا پریتم |
| دہشت گردی کی ثقافت | مضامین | نوم چومسکی |
| چچا سام کیا چاہتا ہے | مضامین | نوم چومسکی |
| افسانے کی حمایت میں | ادبی تنقید | شمس الرحمٰن فاروقی |
| خیال کی مسافت | ادبی تنقید | شمیم حنفی |
| ہمہ اوست | ناول | آغا سلیم |
| اندھیری دھرتی، روشن ہاتھ | ناول | آغا سلیم |
| جلاوطن | افسانے | نور الہدیٰ شاہ |
| دوآبہ | ناول | افضل احسن رندھاوا |
| رات کا رپورٹر | ناول | نرمل ورما |
| وہ دن | ناول | نرمل ورما |
| طوفان کی آہٹ | ناول | مصطفیٰ کریم |
| منتخب افسانے | افسانے | مصطفیٰ کریم |
| عورت: زندگی کا زنداں | مضامین | زاہدہ حنا |
| حالی کا ذہنی ارتقا | ادبی تنقید | ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں |
| شاہ لطیف کی شاعری | ادبی تنقید | الیاس عشقی |
| عالم ایجاد | ادبی تنقید | آصف فرخی |
| منٹو: نہ نوری نہ ناری | ادبی تنقید | ممتاز شیریں |

SCHEHERZADE

شہرزاد کی مطبوعات دستیاب ہیں: فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور

نظم و نثر کے نئے انداز

# دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی اشاعتیں

## عاشق من الفلسطین

سیاسی سماجی تجزیہ اور نظم و نثر کا انتخاب

## دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

## میں بغداد ہوں

موجودہ صورت حال کا ادبی تناظر

SCHEHERZADE

# ناول ناول پاکستان

## پاکستانی معاشرے کے حالات و واقعات کی عکاسی
## پاکستانی زبانوں کا ادب

دیا اور دریا
افضل احسن رندھاوا

عشق کے مارے ہوئے
زاہد حسن

ہمہ اوست
آغا سلیم

جلاوطن
نور الہدیٰ شاہ

انجیر کے پھول
(بلوچستان کے نمائندہ افسانے)
انتخاب و ترجمہ: افضل مراد

دوآبہ
افضل احسن رندھاوا

کہساروں کے یہ لوگ
طاہر آفریدی

تتلی اور ٹینک
احمد سلیم

# دیس بدیس کے ناول، افسانے

چھاکو کی واپسی
بدیع الزماں

کالا جل
شانی

پیلی چھتری والی لڑکی
اُدے پرکاش

وہ دن
نرمل ورما

رات کا رپورٹر
نرمل ورما

ایک چیتھڑا سُکھ
نرمل ورما

اُس کا بچپن
منّو بھنڈاری

ایک ہزار چوراسی کی ماں
مہا شویتا دیوی

مائی
جے شری

دھوپ میں لوگ
غسان کنفانی

بڑا آئینہ
محمد مرابط

سترہ کہانیاں
امرتا پریتم

SCHEHERZADE

# نیم وا دریچے

## ایک مختلف دُنیا کی جھلک

زیرِ ترتیب ترجمے

| | | |
|---|---|---|
| ایک ہزار چوراسی کی ماں | (ناول) | مہا شویتا دیوی |
| شہر میں کرفیو | (ناول) | وبھوتی نارائن |
| چھاکو کی واپسی | (ناول) | بدیع الزماں |
| قیدی عورت کی ڈائری | (خودنوشت) | اختر بلوچ |
| اُس کا بَنٹی | (ناول) | منو بھنڈاری |

---

بہترین افسانہ نگاروں کی تحریریں، تنقیدی تعارف کے ساتھ

ہر کتاب، مکمل انتخاب

## انتخاب

الطاف فاطمہ — ضمیر الدین احمد

ابوالفضل صدیقی — رفیق حسین

مصطفیٰ کریم

افضل احسن رندھاوا

شہرزاد
SCHEHERZADE

صحافی اور سماجی کارکن اسلم خواجہ حیدرآباد میں ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر سے ہی آوارہ گردی کا شوق تھا اور مختلف شہروں میں مختلف نوعیت کے کاموں میں مصروف رہے، جن میں عشق، سیاست، صحافت، ترجمہ، عملی جدوجہد، سماجی خدمت اور بے کاری شامل ہیں۔ ۹۱ء کی دہائی کے سندھی اخباروں میں باقاعدگی سے کالم لکھتے رہے۔ ان اخباروں میں ہلالِ پاکستان، عبرت اور برسات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے لیے انہوں نے اپنے منتخب کالموں کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔

سرورق: ذوالن کیمو سے پکاسو کی نظر میں


شہرزاد
SCHEHERZADE

ISBN # 969-8636-60-9
Price: Rs. 160